ہماری دُعا
کیسے قبول ہو؟

تصنیف

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نوراللہ مرقدہ

تصحیح و تخریج

محمد یاسین قاسمی

باہتمام

مرکز دعوتِ اسلام، جمعیۃ علماء ہند

تفصیلات

نام کتاب	:	ہماری دُعا کیسے قبول ہو؟
مصنّف	:	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نوراللہ مرقدہ
تصحیح و تخریج	:	محمد یاسین قاسمی، مرکز دعوت اسلام، جمعیۃ علماء ہند
طبع اوّل	:	ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ
طبع دوم	:	۲۰۱۵ء
صفحات	:	۷۲
کمپوزنگ	:	نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
طباعت	:	....

قیمت:

....

ناشر

الجمعیۃ بک ڈپو، جمعیۃ بلڈنگ، گلی قاسم جان، دہلی-۶

فہرست عناوین

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

دعا اللہ اور بندوں کے درمیان بہترین رابطہ ہے۔ بندۂ عاجز اپنے مولائے قادر و رحیم کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرتا ہے، اللہ خوش ہوتا ہے اور بندے کی حاجتیں پوری کرتا ہے، اس کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اسے اپنے بندوں کی دعائیں اور حاجتیں پوری کرنی اتنی پسند ہے کہ وہ نہ مانگنے والے بندوں سے ناراض ہوتے ہیں۔ ارشاد نبوی ہے: "منْ لم يَسأل اللهَ، يَغضبْ عليه"۔ (سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب منہ) جو اللہ سے نہ مانگے، اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے۔ اس موضوع پر حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہ کی بڑی وقیع اور اہم تصنیف **"ہماری دعا کیسے قبول ہو"**، جس میں مولاناؒ نے دعا کی حقیقت، دعا کی اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر پیدا کیے جانے والے اشکالات کا ازالہ بڑے مؤثر طریقے سے فرمایا۔

کتاب جمعیۃ علماء ہند کے شعبہ مرکز دعوت اسلام کی جانب سے ماضی میں شائع ہوئی تھی، لیکن اب نایاب تھی۔ محترم المقام حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب مدظلہ العالی صدر جمعیۃ علماء ہند کے حکم اور محترم جناب مولانا سید محمود اسعد مدنی صاحب مدظلہ العالی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کی خصوصی توجہ اور دلچسپی کی بنا پر کتاب دوبارہ شائع کی جارہی ہے۔ اس اشاعت میں جناب مولانا محمد یاسین صاحب رفیق مرکز دعوت اسلام نے آیات کریمہ کا حوالہ اور احادیث شریفہ کی تخریج کردی ہے۔ اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبول اور مفید بنائے، آمین۔

(حضرت مولانا و مفتی) **محمّد راشد** (صاحب اعظمی)
کنوینر مرکز دعوت اسلام جمعیۃ علماء ہند و استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهۡتَدِیَ لَوۡلَا اَنۡ ھَدَانَا اللّٰہُ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَوَّلِیۡنَ وَالۡاٰخِرِیۡنَ وَاِمَامِ الۡمُتَّقِیۡنَ وَ قَائِدِ الغر المُحجلین سَیِّدنا ومَوۡلانا مُحَمَّد وَاٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ، امابعد۔

دعا واجابتِ دعا کا مسئلہ کئی پہلو سے مہتمم بالشان ہے۔ شریعت نے دعا کو مغزِ عبادت، اصلِ عبادت، نتیجۂ عبادت قرار دیا ہے۔ دعا کو اسباب مؤثرہ میں سے سب سے زیادہ مؤثر سبب فرمایا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دُعا کی ترغیب دے کر قبولیتِ دعا کا وعدہ فرمایا ہے۔ قضا کو لوٹا دینے والی اگر کوئی چیز ہے تو دعا ہے۔ مایوسیوں کو مقصد میں کامیاب کر دینے والی، حسرت مندوں کے دِلوں کو مسرت اور نشاط سے لبریز کر دینے والی، نا امیدوں کے مقاصد کو برلانے والی، اسباب ظاہرہ کی طرف سے نا امید ہونے کے بعد پُر امید بنا دینے والی اگر ہے تو دُعا ہے۔

لیکن اس کے بالمقابل جن لوگوں کی عقل محدود ہے، جو مادیات کی دَلدل میں پھنس کر روحانیات کی غیر متناہی قضا سے بے خبر ہیں، جن کی عقل و تجربہ کی کل کائنات اسباب ظاہرہ ہیں، جو ان اسباب سے متجاوز ہو کر مسبّب الاسباب اور ربّ الارباب کی غیر متناہی قدرت اور زبردست حکمتوں تک رسائی سے محروم ہیں، وہ دُعا کو بے اثر جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک دعا کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ بندہ آڑے وقت میں اپنے خالق و مالک کو یاد کرے۔ یا اخلاص و تضرّع کی حالت میں اس کے نام کو وردِ زبان بنائے۔ وہ دعا کی تاثیر اور قبولیت کو عقل کے خلاف سمجھ کر انکار پر تلے ہوئے ہیں۔

قضاءِ مُبرم و معلق ان کے نزدیک بچّوں کا کھیل اور طفل تسلّی ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دعا کی وجہ سے کوئی چیز علم اِلٰہی یا تقدیرِ خداوندی کے خلاف کیسے واقع ہو سکتی

ہے۔اسی لیے وہ اس کو مدعا کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھتے اور نہ تاثیر دعا کے قائل ہیں۔

اِدھر جب دعا کو مدعا کے حصول کا ذریعہ مانا جائے، حقیقی کامیابی کا مدار دعا پر رکھا جائے اور اجابتِ دعا کے بارے میں خداوند عالم کے مستحکم اور پختہ وعدوں کو ملحوظ رکھا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ باوجود بار بار کی دعا کے مقصد پورا نہیں ہوتا، بلکہ حاجت منداس قادر مطلق کی درگاہ سے نامراد واپس آتا ہے، تو دوسری مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔اس حالت کو دیکھ کر جو روزمرّہ مشاہدہ ہوتی رہتی ہے۔ یہ سہل معلوم ہوتا ہے کہ دعا کو محض ایک تعبّدی امر مان لیا جائے جو محض حکم خداوندی کی تعمیل کے لیے مخلوق پر واجب ہے۔اس سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی ہرگز توقع نہ رکھی جائے۔اور تاثیرِ دعا کے لاینحل مسئلہ کو مان کر بہت کی، جو ابد ہی اپنے سر نہ رکھی جائے۔

دعا کی اس اہمیت کو دیکھ کر میرا خیال ہوا کہ تعلیمات اسلام ہر طرح مکمل ہیں ممکن نہیں کہ شریعت نے جس چیز کی ایسے اہتمام سے تعلیم دی ہو اس کا کوئی پہلو ناقص و ناتمام رہ گیا ہو۔میں نے ارادہ کرلیا کہ مسئلہ دعا کو پوری طرح بیان کر دیا جائے۔

دعا واذکار کے متعلق مستقل اور مبسوط کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں اور اس اعتبار سے بظاہر اب کسی نئی تصنیف کی حاجت نہ تھی، لیکن جو باتیں میرے پیشِ نظر ہیں ان کے اعتبار سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلہ پر کچھ لکھوں۔ جو امور میں اس تحریر میں منضبط کرنا چاہتا ہوں ان کا کسی ایک جگہ ملنا دُشوار ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں پر دُعا کی حقیقت اور اس کی تاثیر، شرائط وآداب کا انکشاف بخوبی ہوجائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع میں بہتر اور مفید ہوگی۔اور دعا کے متعلق سب خلجان رفع ہوجائیں گے۔ ہر موقع کے مناسب صحیح دعائیں سہولت سے دستیاب ہوجائیں گی۔اس کے شرائط وآداب وضاحت سے ذہن نشین ہوجائیں گے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب میں اصل مقصد کو شروع کرتا ہوں۔حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

دعا کی حقیقت

لغت کے اعتبار سے

لفظ دعا اور اس کے مشتقات کی لغوی تحقیق اور اس کے حقیقی و مجازی استعمال کی تفصیل اتنی زیادہ ہے کہ یہ کتاب اس کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اس لیے میں ان سب تفصیل کو چھوڑ کر چند امور بیان کر دینا کافی سمجھتا ہوں، جو میرے مقصد کی توضیح و اثبات کے لیے کافی ہوں۔

دعا، دعوۃ، دعوی: یہ تینوں الفاظ مصدر ہیں۔ ان کا ماضی مضارع دعا، یدعو آتے ہیں۔ اہل لغت کے اعتبار سے دعا اور دعوۃ کے معنی کسی کو بلانے کے ہیں۔ الدعا والدعوۃ، خواندن لیکن محض بلانا یا پکارنا یا یاد کرنا ہی نہیں بلکہ دعا اور دعوۃ میں جس کو بلاتے یا پکارتے ہیں اس سے کسی مقصود کی تحصیل کا تعلّق ہوتا ہے۔ عرب کے استعمالات پر وسیع نظر ڈالنے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

یہ معنی عام ہیں کسی کو بلایا جائے، کسی غرض کے لیے بلایا جائے، کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ لیکن لفظ دعا کا استعمال لغت کے عرف میں یا وضع خاص کے طور پر اس معنی عام کے ایک خاص فرد میں ہونے لگا۔ اور جب لفظ دعا بولا جاتا ہے تو یہ خاص معنی مراد ہوتے ہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ کی درگاہ بے نیاز کی طرف راغب و متوجہ ہو کر نہایت عجز و نیاز کے ساتھ مقاصد کو پیش کرنا۔ دستِ طلب دراز کرنا۔

قاموس نے لفظ دعا کی لغوی تشریح کی ابتدا اسی معنی سے کی ہے:

اَلدُّعَاءُ الرَّغْبَۃ اِلیَ اللہ۔

ترجمہ: دعا کے معنی خدا تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے کے ہیں۔

صاحب تاج العروس اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اَلرَّغبَۃ اِلیَ اللہ فِیْمَا عندہ من الخیر والابتھال الیہ بالسوال ومنہ قولہٗ تعالیٰ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً۔ (فصل الدال، جلد اوّل، ص ۸۳۸۱)

ترجمہ: دعا کے معنی خدا تعالیٰ کے یہاں جو کچھ خیر و بھلائی ہے اس کی طرف رغبت کرنے اور اس کے سامنے عجز و نیاز کے لیے سوال کرنے کے ہیں اور اسی پر دلالت کرتا ہے خدا تعالیٰ کا ارشاد: اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً۔ (الاعراف، آیت ۵۵، پ۸)

اور جب کہ لغت میں دعوۃ اور دعا کے اندر بلانے کے ساتھ مقصود کا حصول بھی مدِّ نظر ہوتا ہے تو اس وجہ سے اس کے جواب میں اجابت کا لفظ آ تا ہے۔ اجابت کے معنی قبول کرنے کے ہیں۔ یعنی اس نے بلانے والے کی عرض کو قبول کرلیا۔ اور جس غرض کے لیے بلایا گیا تھا اس کی تکمیل کے لیے آمادہ ہوگیا۔

لفظ دعا اور ذکر میں بھی فرق ہے۔ دعا میں —— جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں —— کسی غرض کے لیے بلانا یا پکارنا ہوتا ہے۔ اور ذکر میں محض یاد کرنا۔ اس میں کسی کو بلانا یا اس سے کسی غرض و مقصود کی تحصیل پیشِ نظر نہیں ہوتی۔ محب اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے۔ اس کو اس کے ذکر ہی میں لذّت ہے۔ نہ وہ سامنے ہے نہ اس کو بلاتا ہے۔ نہ اس کے سامنے کسی مطلب و مدعا کو پیش کر کے کامیابی کی اُمید لگائے بیٹھا ہے۔ بسا اوقات میدانِ جنگ میں توپ و تفنگ کے منہ میں ہوتا ہے۔ نیزہ و تلوار کی چمک اس کی نظر کو چکا چوند کرنے کے لیے بجلی کی طرح کوندرہی ہوتی ہے۔ اور وہ بھی جانتا ہے کہ میری روح ابھی ابھی اس جسم کو چھوڑ کر اپنی اصلی جگہ و مرکز کو لوٹنے والی ہے۔ مگر یہ شخص ہے کہ اس کو نہ موت کا ڈر ہے نہ اپنی حفاظت کی فکر بلکہ محبوب کے ذکر میں محو ہے۔ اور اسی بے خودی میں جان بھی دے دیتا ہے۔ حماسہ کا ایک شاعر اپنے محبوب کے زائد از خیال تعلّق و محبت کو اس طرح ظاہر کرتا ہے ؎

ذَکَرْتُکِ وَالْخَطِّیُّ یَخْطِرُ بَیْنَنَا
وَقَدْ نَہِلَتْ مِنَّا الْمُثَقَّفَۃُ السُّمُرُ (قال ابو عطاء السندی)

ترجمہ: میں نے تجھ کو ایسے وقت یاد کیا کہ نیزے ہمارے درمیان حرکت کررہے تھے اور سیدھی کی ہوئی برچھیاں ہمارے خون سے سیراب ہورہی تھیں۔

غرض ذکر میں تعلق ومحبت کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ کہ طلب مدعا ومقصود۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر حق تعالیٰ ذکر کے موقع پر:

فَاذْكُرُونِيْ اَذْكُرْكُمْ۔ (تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔)

اور دعا کے جواب میں ارشاد فرمایا:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ (غافر، آیت ۶۰، آیت ۲۴)

ترجمہ: تمھارے رب نے کہا مجھ کو پکارو میں جواب دوں گا۔

علیٰ ہٰذا الفظ دعا اور ندا میں بھی فرق ظاہر ہے۔ جس کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ اس کے علاوہ لفظ دعا، دعوۃ، دعویٰ۔ یا ان کے مشتقات یا ان ابواب کا جوان سے بنائے گئے ہیں۔ اگر کسی جگہ ایسے معنی میں استعمال ہوا ہے جس میں طلب وسوال نہیں ہے تو وہ بطور توسیع کے ہے۔ جیسا کہ زبان عرب کا خاصہ ہے کہ اصل لفظ کسی ایک معنی کے لیے موضوع ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اندر توسیع ہوتے ہوتے بہت سے معنی میں استعمال ہونے لگتا ہے۔ مثلاً دعا، یدعو، کو باب تفاعل میں لے جا کر تداعی یتداعی بنالیا۔ اور تداعی کے معنی یہ ہیں کہ جمع ہونے کے لیے باہم آواز دے کر پکاریں۔ یا تداعی کے معنی یہ ہیں کہ معرکہ کے وقت ہر شخص اپنے آپ کو اپنی قوم اور فرقہ کی طرف منسوب کرے ان دونوں استعمالوں میں دعا کے اصلی معنی طلب وسوال ملحوظ نہیں ہیں۔ یا مثلاً کہتے ہیں:

دعوت فلانا ای صحت بہ۔ (یعنی میں نے اس کو للکارا۔)

یا کلام اللہ میں ارشاد ہے:

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ۔ (الحج، آیت ۱۷، پ ۱۳)

لسان العرب میں ہے:

فان ابا اسحٰق ذهب الیٰ ان یدعو بمنزلۃ یقول۔ (باب الدعاء، ج ۱۴، ص ۲۵۷)

ترجمہ: ابواسحاق زجاج (لغت کے مشہور ومعروف امام ہیں) کہتے ہیں کہ یہاں یدعو بمنزلہ یقول کے ہے یعنی وہ کہتا ہے۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ استعمالات بھی دعا کے اصلی معنی طلب وسوال سے خالی نہیں ہیں۔ تداعی بمعنی اجتماع میں استعانہ بالرائے وغیرہ مقصود ہوتے ہیں اور آیۃ میں یدعو کا اصلی معنی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہونا بہت کچھ ظاہر ہے۔

دعا کی حقیقت شرعاً

شریعت میں بھی دعا کی وہی حقیقت ہے جو لغت میں ہے۔ یعنی اپنے مالک وخالق کے سامنے تضرع وابتہال، عجز ونیاز، خواری وزاری کے ساتھ دست طلب پھیلانا۔ اور اپنے قلبی مقصود کو اس کے سامنے پیش کرنا۔ لیکن اصلی لغوی معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت نے دعا میں کچھ توسیع بھی کی ہے۔ دل سے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔ اور اپنے مقاصد پیش کرے اور زبان سے سوال نہ کرے یہ بھی دعا ہے۔ خدا تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے اور کوئی مدعا ومطلب پیش نہ کرے اس کو بھی شریعت میں دعا کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا شب وروز عبادت خداوندی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تلاوتِ قرآن، ذکر وفکر میں مشغول رہے۔ اور ایک دفعہ بھی اپنی حاجت پیش نہ کرے یہ بھی دعا ہے۔

وَقَالَ اَبُوْ اِسْحٰق فِیْ قَوْلِهٖ: اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ: مَعْنٰی الدُّعَاءِ لِلّٰهِ عَلٰی ثَلٰثَةِ اَوْجهٍ: فَضربٌ مِنْهَا تَوْحِیْدُهٗ وَالثَّنَاءُ عَلَیْهِ، كَقَوْلِكَ: يَا اللهُ! لَااِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ، وَ كَقَوْلِكَ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ۔ اِذَا قُلْتَهٗ فَقَدْ دَعَوْتَهٗ بِقَوْلِكَ رَبَّنَا، ثُمَّ اَتَیْتَ بِالثَّنَاءِ وَالتَّوْحِیْدِ وَ مِثْلُهٗ قَوْلُهٗ: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ۔ فَهٰذَا ضربٌ مِنَ الدُّعَاءِ۔ وَالضَّربُ الثَّانِیْ مَسْئَلَةُ اللهِ الْعَفْوَ وَالرَّحْمَةَ وَمَایقربُ مِنْهُ، كَقَوْلِكَ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا۔ وَالضربُ الثَّالِثُ مَسْئَلَةُ الْحظِ مِنَ الدُّنْیَا، كَقَوْلِكَ: اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ مَالًا وولدا۔

وَاِنَّمَا كَانَ هٰذا جمعُيه دعاءً، لِاَنَّ الْاِنْسَانَ يُصَدِّرُ فِيْ هٰذِهِ الْاَشْيَاءِ بِقَوْلِهِ يَا اللهُ يَارَبُّ يَارَحْمٰنُ، فَلِذٰلِكَ سُمی دعاء۔ وَفِيْ حَدِيْثِ عرفة اَكثر دعائی ودعاءُ الْاَنْبِيَاءِ قبلی بعرفات: لَااِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر، وَاِنَّمَا سُمی التَّهْلِيْلُ وَالتَّحْمِيْدُ وَالتَّمْجِيْدُ دعاءً، لِاَنَّه بِمَنْزِلَتِهِ فِيْ استيجابِ ثَوَابِ الله وَجَزائِهِ، كَمَا لْحَدِيْثِ الْاٰخر اِذَ اشغلَ عَبْدِی ثَنَاءُه عَلَيَّ مِنْ مَسئلتی اعطيتُه اَفْضَلَ مَا اُعْطِيَ السَّائِلِيْنَ۔ (لسان العرب، ج۱۴، ص۲۵۷)

ترجمہ: ابواسحاق اللہ تعالیٰ کے ارشاد اجیب دعوۃ الداع کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے دعا کرنا تین طرح پر ہے: ایک قسم تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کی ثناء وصفت بیان کرے مثلاً کہے یااللہ لا الٰہ الا انت یا کہے ربنا لك الحمد اور اسی کی مثل ہے قول باری تعالیٰ کا وقال ربکم ادعونی استجب لکم۔
دوسری قسم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے عفو ورحمت اور ان باتوں کا سوال کرے جس سے اس کا قرب حاصل ہو۔ مثلاً اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا کہنا۔ تیسری قسم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دنیا کی کسی چیز کو طلب کرے مثلاً کہے الٰہی مجھ کو مال و دولت دے دے۔ ان سب قسموں کو دعا اس لیے کہتے ہیں کہ ان الفاظ میں ندا مثلاً یَا اللّٰہُ یَارَبُّ یَارَحْمٰنُ کا استعمال ہوتا ہے۔ عرفہ کی حدیث میں آیا ہے میری دُعا اور مجھ سے پہلے جو انبیا گزرے ہیں ان کی اکثر دعا عرفات میں یہ ہوتی تھی: لَااِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر۔

تہلیل وتمجید اگرچہ سوال نہیں مگر چوں کہ ثواب وجزا واجر کے استحقاق میں یہ بھی بمنزلہ دعا کے ہیں اس لیے ان کو بھی دعا کہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ جب کہ میرا بندہ مجھ پر ثنا کرنے میں ایسا مشغول ہو کہ سوال کی نوبت نہ آئے تو میں اس کو سائلین سے بھی زیادہ اور اچھا دیتا ہوں۔

ابواسحاق کے اس بیان سے ہمارے دونوں مدعا ثابت ہو گئے۔

اوّل یہ کہ دعا فقط بلانے یا پکارنے کا نام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کو یہ کہنے کی حاجت نہ تھی کہ چوں کہ تہلیل و تمجید مقصود کی طلب اور حاجت کے سوال میں بمنزلہ دعا کے ہیں اس لیے ان پر دعا کا اطلاق کیا گیا۔ اور یہ وہی بات ہے جس کو ہم دعا کی حقیقت لغوی میں بیان کر چکے ہیں۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

وحقیقة الدعاء استدعاء العبد ربه جل جلاله العنایة واستمداده ایاه المعونة۔ (ج۳، ص۱۱۱)

ترجمہ: حقیقت دعا یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے مدد اور رحمت وعنایت کا طالب ہو۔

دویم یہ کہ عبادت و ذکر و تسبیح میں مشغول ہونا بھی دعا میں داخل ہے۔ گو زبان سے دعا کرے یا نہ کرے اور اس سے بطریق اولیٰ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبان سے گو سوال نہ کرے مگر دل سے سوال کرے تو وہ بھی دعا میں داخل ہو گا۔

اور یہی وہ مضمون ہے جس کو اس بیان میں ہم ثابت کرنا چاہتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت میں دعا اس کو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سامنے تذلل و تضرع کے ساتھ اپنے مطالب کو خواہ دینی ہوں یا دنیوی، گناہوں کی معافی کی طلب ہو یا اعطاءِ منافع، خواہ زباں سے ہو یا دل سے، قال سے ہو یا حال سے، پیش کرے۔

فضیلت و مرتبہ دعا

خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو آلائش و میل کچیل سے طاہر و مطہر بنانے، ان کو اپنی ذات پاک کے سوا تمام تعلقات سے یکسو اور الگ کرنے، ان کو اپنی درگاہ عالی میں درجہ قریب واختصاص عطا کرنے کے لیے ان پر ہر قسم کی عبادت مالی و بدنی، روحی و قلبی کو فرض کیا ہے۔ نماز، روزہ اگر بدنی عبادت ہیں، تو زکوٰۃ مالی اور حج و جہاد دونوں کو شامل ہے۔ اور ان سب کے لیے عبادت قلبی شرط ہے۔ یعنی عبادت کی نیت واخلاص۔ نیت نہ ہو تو کوئی عبادت عبادت ہی نہیں ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات (بخاری ج اوّل، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم) (عمل کا مدار نیت پر ہے)

اخلاص نہ ہوتو گوادائے فرض سے ظاہراً سبکدوش ہوجاتا ہے،مگر وہ عبادت نہ مقبول ہے، نہ اس سے جومقصود ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔نہ اَجر وثواب اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن دعا کو جوفضیلت وفوقیت عطا فرمائی گئی ہے۔اورجن آ ثار کے ترتب کا اس پر وعدہ کیا گیاہے،وہ کسی کوحاصل نہیں۔جناب باری عزاسمہٗ ارشادفرماتے ہیں:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ۔ (غافر، پ ۲۴، آیت ۶۰)

ترجمہ: تمھارے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔ جولوگ تکبر کرتے ہیں میری عبادت سے،قریب ہے کہ داخل ہوں گے جہنم میں ذلیل ہوکر۔

اس ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ جولوگ دعا سے اعراض کرتے ہیں وہ حقیقتاً عبادت سے اعراض کرتے ہیں۔کیوں کہ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے افعال واعمال سے اس امر کوظاہر کردے کہ میں بندہ ہوں اوروہ رب، میں مخلوق ہوں وہ خالق، میں محتاج ہوں وہ غنی، میں عاجز ہوں وہ قادر۔غرض ہرادا سے اپنی عبدیت وافتقار کواور اس کی معبودیت اور مالکیت کوظاہر کرے۔ جوشخص عبادت کی حقیقت کوسمجھتا ہے وہ ان افعال کومحض عبادت ورسم کے طور پرادانہیں کرتا۔اس پر بالکل منکشف اور واضح ہوجاتا ہے کہ میں اپنے اختیار سے اپنی ذات کونفع ونقصان کچھ نہیں پہنچاسکتا۔نفع وضرر کا مالک اورمنعم ومعطی حقیقی وہی ہے۔اس لیے جوشخص حقیقتاً عبادت کرتا ہے وہ اپنے تمام ارادوں، خیالات اور اسباب ظاہرہ سے کلیتاً الگ ہوکر خداوند عالم کے سامنے خودمع اپنے تمام حوائج کے پیش ہوتا ہے۔دل سے سب تخیلات کومٹا کرسادہ لوح بن کرحاضر ہوتا ہے۔

اور دعا کی حقیقت بھی یہی ہے کہ سوائے خداوند عالم کے کسی کومعطی اور مانع نہ سمجھے۔اور پوری تذلل وانقیاد سے خودمع اپنے تمام حوائج کے اس کے سامنے پیش ہوکر زبان سے یا دل سے سوال کرے۔ پس جوشخص کہ دعا سے اعراض کرتا ہے۔ دعا کو مؤثر نہیں سمجھتا اس کے یہی معنی ہیں کہ اس کواپنی عبدیت وافتقار اور خداوند عالم کی مالکیت اور رب الارباب ہونے میں شک ہے۔ورنہ اس کے کیا معنی کہ جب اس کے

سوا نہ کوئی خالق ہے نہ مالک، نہ معطی ہے نہ مانع۔ پھر وہ کیوں اپنی حاجتوں کو اس کے سامنے پیش نہ کرے۔ اور مخلوق کے دروں پر بھیک مانگتا پھرے۔ اور جب اس کو اپنی عبدیت اور اس کی معبودیت میں شک و تردّد ہے، تو عبادت اور ثوابِ عبادت کی حاجت کیا ہوگی۔ اور وہ کیونکر عبادت کی طرف مائل اور راغب ہوگا۔ خلاصہ یہ نکلا کہ دعا سے اعراض یا تغافل یا تساہل یا اس کو غیر مفید و غیر مؤثر سمجھنا حقیقتاً عبادت سے اعراض کرنا ہے۔ اور عبودیت و عبدیت سے گزر کر اپنے لیے درجۂ کبریائی و استغنا کا در پردہ دعویٰ کرنا ہے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:

وَقَالَ الْجَمْهُوْرُ الْاَعْظَمُ مِنَ الْعُقَلَاءِ اِنَّ الدُّعَاءَ اهمُ مقاماتِ العبوديةِ۔ (ج ۳، ص ۱۱۲)

ترجمہ: عقلا کا گروہ اعظم (چند نادانوں کو چھوڑ کر) اس کا قائل ہے کہ مقامات عبودیت میں سب سے زیادہ اہم اور اعظم دعا ہے۔

آیۃ شریفہ کے اس مضمون کی تائید احادیث سے ہوتی ہے۔

(۱) **اَلدُّعَاءُ هُوَالْعِبَادَةُ۔**

دعا ہی عبادت ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الدعوات، ص ۱۹۴)

(۲) **اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔**

دعا عبادت کا مغز ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الدعوات، ص ۱۹۴)

اوّل حدیث کا مضمون تو بعینہٖ مطابقِ مضمونِ آیت شریفہ ہے کیوں کہ وہاں دعا کے حکم کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ جو لوگ میری عبادت سے اعراض کرتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دعا عین عبادت ہے۔

دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا عبادت کا مغز و خلاصہ ہے۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ عبادت بغیر دعا بالکل غیر مفید اور بیکار شئے ہے۔ جیسا پوست بغیر مغز کے۔

غرض آیت شریفہ اور احادیث مذکورہ سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ دعا اصل عبادت ہے عبادت بغیر دعا کے بیکار اور غیر مفید ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

لَایَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ۔ (مشکوٰۃ کتاب الدعوات، ص ۱۹۵)

ترجمہ: قضائے الٰہی اور تقدیر کو سوائے دعا کے کوئی چیز نہیں ٹال سکتی اور نہیں بدل سکتی۔

اس حدیث کے مضمون سے دعا کی فضیلت و فوقیت جس قدر ثابت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ کسی عبادات اور عمل صالح کے بارے میں ایسا نہیں فرمایا گیا۔ یہ خصوصیت وفضیلت صرف دعا کو حاصل ہے۔ رہی یہ بات کہ دعا کی وجہ سے تقدیر الٰہی کیسے بدل سکتی ہے۔ اس کو ہم دعا کی تاثیر کے موقع پر بیان کریں گے۔ یہاں تو صرف اس کی فضیلت وفوقیت کو بیان کرنا تھا سو یہ امر بحمد اللہ حاصل ہو گیا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس بیان کو ختم کریں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

تقریر شبہ

دعا جداگانہ شے ہے کیوں کہ دعا میں سوال اور طلب حاجت ہوتی ہے اور عبادت ارکان مفروضہ کے ادا کو کہتے ہیں۔ پس دعا کا عین عبادت فرمانا جیسا کہ اوّل حدیث سے معلوم ہوتا ہے کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اگر کسی وجہ سے اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ دعا و عبادت شے واحد ہیں تو دوسری حدیث اس کی مخالف و معارض ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ دعا مغز عبادت ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبادت و دعا دو علاحدہ علاحدہ امر ہیں۔ پھر اگر دونوں حدیثوں کے مضمون کو صحیح مان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ شئے اور مغز شئے ایک ہو جائیں اور یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ پوست کو مغز کہہ دیا جائے۔

جواب شبہ

اس شبہ کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے۔

جواب اوّل کی تقریر: دعا کو عین عبادت فرمانا اور دعا کو مغز عبادت فرمانا دونوں

صحیح ہیں مگر دو اعتبار سے۔ اگر ایک اعتبار سے دعا کو عین عبادت یا مغز عبادت فرمایا جاتا تو بیشک تعارض ہوتا۔ یعنی دعا میں دو حیثیتیں ہیں: ایک حیثیت سے اس کو عین عبادت کہہ سکتے ہیں اور ایک اعتبار سے مغز عبادت۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ عبادت — جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں — اظہار عبدیت وافتقار کو کہتے ہیں اور خلاصہ تمام عبادات کا یہ ہے کہ بندہ اپنے خالق و مالک کے سامنے ہر ممکن طریقے سے تذلل وانقیاد، خضوع وخشوع، افتقار واحتیاج کا اظہار کرے دل سے اور جوارح سے۔ جان سے اور مال سے۔ اور ہمہ تن حاجت اور صورت سوال بن جائے۔ اور اس اظہار میں تمام روح وجسم وقلب اعضا و جوارح کو شریک ہونا لازم قرار دیا گیا ہے۔ دل میں اگر خشوع وخضوع کا ہونا ضروری ہے تو اعضائے جسمانی کا افتقار واحتیاج کی صورت میں ظاہر کرنا لازم ہے اور زبان سے اپنی حاجات کو عجز و نیاز کے ساتھ پیش کر کے نجاح وفلاح کا طالب ہونا واجب ہے۔ دعا کے معنی اگرچہ سوال اور طلب حاجت کے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ سوال زبان ہی سے ہوا کرے۔ بسا اوقات اپنی فانی اور اس کے باقی، اپنی مخلوق ومعدوم اور اس کے خالق وموجود، اپنے محتاج وفقیر، اس کے غنی ومعطی ہونے کا یقین دل میں اس قدر راسخ ہوتا ہے اور اس کی قلبی وجسمانی حالت اس کے اس یقین کو اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ زبان سے اظہار کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بلکہ یہ حالت ایسی غالب آ جاتی ہے کہ زبان گنگ ہو کر اظہار حال سے عاجز وقاصر ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دعا وعبادت کا شئے واحد ہونا ظاہر اور بدیہی چیز ہے اور اس حیثیت سے اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ فرمانا بالکل درست اور صحیح ہے۔

اور جب یہ دیکھا جائے کہ عبادات کے وقت یا ان سے فراغت کے بعد دعا کا خصوصیت سے حکم ہے تو دعا اور عبادت دو جداگانہ امر معلوم ہوتے ہیں۔ عبادت اصل شئے اور دعا یعنی سوالِ مقاصد اس کا ثمرہ اور خلاصہ ومغز ہے۔ یعنی ارکان عبادت سے جو مقصود اپنی عبدیت وافتقار کا اظہار تھا، اس کی تکمیل دعا کی صورت میں ہوتی ہے اور

اس حیثیت واعتبار سے یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ دعا مغزعبادت وثمرۂ عبادت ہے۔

فائدہ: ہماری مذکورہ بالا تقریر سے جیسا کہ یہ ثابت ہوگیا کہ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ اور اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةُ فرمانا صحیح ہے۔ اسی بنا پر اگر حقیقت دعا اور حقیقت عبادت کو ذہن نشیں کر کے اَلْعِبَادَةُ هُوَ الدُّعَاء(عبادت دعا ہی کا نام ہے) کے مضمون کو بھی صحیح مان لیا جائے تو بظاہر درست اور صحیح ہے۔ گو الفاظ حدیث سے صراحتاً یہ مضمون ثابت نہیں ہوتا مگر حقیقت کے انکشاف کے بعد اس کی تسلیم میں کچھ تامل کی بھی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

تقریر جواب دویم

دعا وعبادت اگرچہ اپنی اصل حقیقت میں مشترک ہیں، مگر اصطلاح شریعت میں ارکان مفروضہ کے ادا کو عبادت اور طلب حاجت کو دعا کہتے ہیں۔ اور اس وجہ سے بیشک یہ دونوں چیزیں جدا جدا ہیں۔ نہ دعا عین عبادت ہے نہ عبادت عین دعا، لیکن باایں ہمہ جو دعا کو عبادت فرمایا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی جزو اعظم یا فرد کامل پر کل کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ مثلاً انسان تمام اعضا کے مجموعہ کا نام ہے، مگر انسان میں راس جزو اعظم ہے عقل وحواس، سمع وبصر جن پر انسان کی انسانیت اور زندگی کا مدار ہے اس کے اندر موجود ہیں۔ اس وجہ سے راس بول کر انسان مراد لے لیتے ہیں۔

اسی طرح دعا بھی عبادت کا جزو اعظم ہے۔ دعا پر عبادت کا اطلاق آجاتا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ اقرار توحید کے بعد خدا تعالیٰ نے جس قدر عبادتیں اپنے بندوں پر فرض کی ہیں، ان سب میں افضل واعلیٰ نماز ہے۔ عبادات کی ترتیب میں بھی سب سے مقدم نماز کو رکھا گیا ہے۔ نماز ہی وہ عبادت ہے کہ جو آدمی پر ہر حالت میں فرض رہتی ہے۔ نہ حالت سفر میں اس سے سبکدوشی ہوتی ہے اور نہ مرض میں، نہ معرکہ آرائیوں میں اس کی فرضیت ساقط ہوتی ہے نہ کسی اور وقت میں۔ باقی عبادات کا یہ حال نہیں ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قَالَ سَاَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَیُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ؟ قَالَ: الصَّلٰوۃُ لِوَقْتِہَا۔ قُلْتُ: ثُمَّ اَیٌّ؟ قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَیْنِ۔ قُلْتُ: ثُمَّ اَیٌّ؟ قَالَ: اَلْجِہَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ قَالَ: حَدَّثَنِیْ بِہِنَّ وَلَوِاسْتَزَدْتُّہٗ لَزَادَنِیْ۔

(بخاری اول، فضل الصلاۃ لوقتہا، ص ۷۶)

ترجمہ: ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ کونسا عمل ہے؟ فرمایا: نماز کا وقت پر ادا کرنا۔ میں نے عرض کیا: اس کے بعد کونسا؟ فرمایا: والدین کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا۔ میں نے عرض کیا: پھر کونسا؟ فرمایا: خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ آپ نے ان تین اعمال کے متعلق ارشاد فرمایا۔ اگر میں اور دریافت کرتا تو آپ کچھ اور بھی فرماتے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: بَیْنَ الْعَبْدِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ۔ (مسلم، بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوٰۃ ص ۶۱)

ترجمہ: یعنی ایمان وکفر کی حد فاصل نماز ہے۔

عبداللہ بن شقیق سے روایت ہے۔

قَالَ کَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ لَایَرَوْنَ شَیْئًا مِنْ اَعْمَالٍ تَرْکُہٗ کُفْرٌ غَیْرَ الصَّلٰوۃِ۔ (مشکوۃ، کتاب الصلاۃ، ص ۵۹)

ترجمہ: اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے سوا کسی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔

مذکورہ بالا احادیث کے مجموعہ سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ اعمال میں سب سے افضل سب سے زیادہ محبوب اور ایمان کی اصل علامت اور کفر و اسلام میں امتیاز پیدا کردینے والی نماز ہے گویا تمام عبادات و اعمال صالحہ کی اصل اصول نماز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو اہتمام نماز کی تعلیم کا ہے اس درجہ کسی اور عمل کا نہیں ہے۔

بچوں پر فرض ہونے سے قبل اس کی تعلیم وتلقین کا حکم ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ وَھُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَ ھُمْ اَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِیْنَ۔ (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ، ص۵۸)

ترجمہ: اپنی اولاد کو جب کہ وہ سات برس کی عمر کو پہنچ جائیں نماز کا حکم کیا کرو۔ اور جب کہ دس برس کی عمر میں پہنچ جائیں تو مار کر سکھایا کرو۔

ظاہر ہے کہ دس برس کے بچے پر نماز فرض نہیں ہوتی۔ بلکہ زمانۂ بلوغ کا خیال کیا جائے تو ابھی اس کی فرضیت میں کئی سال باقی ہوتے ہیں لیکن نماز کی یہ تاکید ہے کہ ابھی سے اس کی تعلیم پر تشدد اور ضرب کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ تاکید اور کسی فرض وعمل کے بارے میں نہیں ہے۔

اور نماز میں رکن اعظم جو زیادہ قرب خداوندی کا ذریعہ ہوتا ہے سجدہ ہے۔ جو تقرب بندہ کو خدا تعالیٰ کے یہاں سجدہ میں ہوتا ہے اور کسی حالت میں نہیں ہوتا۔ خدائے برتر کا ارشاد ہے: فَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ (سجدہ کر اور قربت حاصل کر۔) (العلق، پ ۳۰، آیت ۱۹)

اور حدیث شریف میں آتا ہے:

اَقْرَبُ مَایَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّہٖ عَزَّوَجَلَّ وَھُوَ سَاجِدٌ فَاَکْثِرُوْا فِیْہِ مِنَ الدُّعَاءِ۔ (ابو داؤد، باب الدعاء فی الرکوع والسجود، ص۱۲۷)

ترجمہ: تمام حالتوں سے زیادہ بندہ اپنے رب کے قریب حالت سجود میں ہوتا ہے۔ تو اس میں تم بہت دعا کیا کرو۔

اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی عظمت شان وعلوم مرتبت کے مقابلہ میں بندہ جس قدر اپنی پستی وذلت کا اظہار کرے گا اسی قدر قریب تر ہوگا۔ نماز کے ارکان پر اوّل سے آخر تک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح معلوم ہوتی ہے کہ جو تذلل وتواضع سجدہ میں ہے باقی ارکان میں نہیں ہے۔ دیکھیے اوّل دست بستہ قیام، اس کے بعد رکوع یعنی جھکنا اور اس کے بعد سجدہ یعنی پیشانی کو زمین پر رکھنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

قیام سے رکعت کی ابتدا ہو کر سجدہ پر اختتام ہوا۔ دست بستہ قیام میں اظہار تذلل ہے۔ مگر نہ اتنا جتنا کہ رکوع میں، رکوع میں گو بہ نسبت قیام کے بہت زیادہ اظہارِ عبدیت و تذلل وخشوع ہے، مگر جو بات سجدہ میں ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ سجدہ میں عبدیت کا پورا پورا اظہار ہے۔ افعال تعظیمی میں سجدہ سے بڑھ کر کوئی فعل نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالت رکوع میں فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَ مُخِّيْ وَعِظَامِيْ وَعَصَبِيْ۔ (مسلم، الدعاء في صلاة الليل)

ترجمہ: الٰہی میں نے تیرے ہی لیے رکوع کیا اور تجھی پر ایمان لایا اور تیری ہی اطاعت کی۔ پست ہوئے تیرے سامنے میرے کان اور آنکھ اور مغز اور ہڈی اور پٹھے۔

اس تعلیم نبوی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بندہ حقیقتاً سجدہ کے قابل اس وقت ہوتا ہے جب کہ خشوع وخضوع بدرجہ کمال حاصل ہو کہ رگ وپے میں سرایت کر جائے اور وہ اس حالت پر پہنچ جائے کہ بے اختیار اپنے چہرہ کو زمین پر رکھ دے۔ اور سجدہ کی حالت میں کوشش اور جدوجہد کے ساتھ بکثرت دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا حدیث جس میں فرمایا گیا ہے کہ سب حالتوں سے زیادہ بندہ کو اپنے ربّ سے حالت سجدہ میں قرب ہوتا ہے۔ ارشاد ہے: فَاَكْثِرُوْا فِيْهِ مِنَ الدُّعَاءِ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایسے قرب کے وقت جس سے بڑھ کر کوئی قرب نہیں دعا میں کوتاہی نہ کرنی چاہیے بلکہ جس قدر اور جس کثرت سے ممکن ہو دعا کرنی چاہیے۔

دوسری روایت میں ابن عباس سے مروی ہے:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَقْرَاَ الْقُرْاٰنَ رَاكِعًا اَوْ سَاجِداً، فَاَمَّا الرُّكُوْعُ فَعَظِّمُوْا فِيْهِ الرَّبَّ تَعَالٰى وَاَمَّا السُّجُوْدُ فَاجْتَهِدُوْا فِيْهِ بِالدُّعَاءِ فَاِنَّهٗ فَمِنْ اَنْ يُّسْتَجَابَ لَكُمْ۔

(ابو داؤد، باب الدعاء فی الرکوع والسجود، ص۱۲۷)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں مجھ کو ممانعت کی گئی

ہے کہ حالت رکوع وسجدہ میں قرآن پڑھوں۔ رکوع میں تو خدا تعالیٰ کی عظمت بیان کیا کرو اور سجدہ کی حالت میں خوب دعا کیا کرو کیوں کہ اس حالت میں دعا کی قبولیت کی زیادہ توقع ہے۔

تیسری روایت میں ہے:

مَامِنْ عَبْدٍ يَسْجُدُ لِلّٰهِ سَجْدَةً اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً۔ (مسلم، باب فضل السجود والحث علیه، ص۱۹۳)

ترجمہ: کوئی بندہ سجدہ نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ عزوجل اس کی وجہ سے اس کے درجات بلند کرتا اور گناہ معاف کردیتا ہے۔

ربیعہ بن کعب الاسلمی فرماتے ہیں:

كُنْتُ اٰتِىَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بِوَضُوْئِهٖ وَبِحَاجَتِهٖ فَقَالَ سَلْنِىْ فَقُلْتُ مُرَافَقَتُكَ فِى الْجَنَّةِ قَالَ اَوْ غَيْرَ ذَالِكَ قُلْتُ هُوَ ذَالِكَ قَالَ فَاَعِنَّ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ۔

(مسلم، باب فضل السجود والحث علیه، ص۱۹۳)

ترجمہ: میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وضو کا پانی اور مسواک وغیرہ حاضر کرتا تھا۔ آپ نے از راہ مسرت ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: کوئی شئے طلب کرو۔ میں نے عرض کیا کہ جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا: کوئی اور بات مانگو۔ میں نے عرض کیا یہی چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا بہت اچھا مگر تم سجدے بکثرت کرکے اس قابل بن جانے کی کوشش کرو۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اونچے مراتب اور بلند مقامات کے حصول کے لیے جو امور شرط ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت جنت میں اعلیٰ ترین مقام ہے۔ اور اس کے حصول کے لیے کثرت سجود کا حکم ہوا۔ اس سے بڑھ کر سجدہ کی فضیلت اور اہمیت کیا ہوسکتی ہے۔

مذکورہ بالا احادیث سے سجدہ کی فضیلت اور قرب خداوندی کی زیادتی کا سبب

ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دعا کی کثرت کا موقع ہے۔ اور قبولیت کی توقع بھی زیادہ تر اسی وقت ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز خود بھی یہی تھا۔ آپ سجدہ کی حالت میں نہایت گڑگڑا کر بکثرت دعا مانگتے تھے اور جو الفاظ بھی اپنی پستی اور خدا تعالیٰ کی عظمت کے ملتے تھے ان کو استعمال فرماتے تھے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے:

اِنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم كَانَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يُصَلِّيْ تَطَوُّعاً قَالَ اِذَا سَجَدَ: اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُّ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ اللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ سَجَدَ وَجْهِيْ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ۔ (مسلم، باب الدعاء فی صلاۃ اللیل)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت نفلیں پڑھتے تھے تو سجدہ کی حالت میں فرمایا کرتے تھے: الٰہی تیرے ہی لیے سجدہ کیا اور تجھی پر ایمان لایا اور تیرے ہی سپرد کیا۔ اے اللہ! تو ہی میرا ربّ ہے میرے چہرہ نے اس ذات کے لیے سجدہ کیا جس نے اس کو پیدا کیا اور اس کی صورت بنائی اور کان اور آنکھ بنائی۔ پاک و برتر ہے۔ اللہ جو سب خالقین سے بہتر اور احسن ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

قَالَتْ فَقَدْتُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّم: لَيْلَةً مِّنَ الْفَرَاشِ فَالْتَمَسْتُهٗ فَوَقَعَتْ يَدِيْ عَلٰى بَطْنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَ فِى الْمَسْجِدِ وَ هُمَا مَنْصُوْبَتَانِ وَهُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔ (مسلم، باب مایقال من الرکوع والسجود، ص ۱۹۲)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک شب (آنکھ کھلی) اور رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا تو میں نے آپ کو ڈھونڈا میرے ہاتھ آپ کے قدموں پر پڑے تو آپ کو سجدہ کی حالت میں پایا۔ اور آپ کے دونوں قدم کھڑے تھے۔ اور آپ اس حالت میں فرماتے تھے: الٰہی میں تیری رضا کے ساتھ تیرے غصّہ سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری معافی کے ساتھ تیرے عذاب سے اور تیری ذات کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتا ہوں میں۔ تیری ثناء و وصف کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ تو ایسا ہے جیسا تو نے خود اپنے ذات کی ثنا و توصیف کی ہے۔

اس حدیث کی بعض دوسری روایتوں میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ مقولہ بھی منقول ہے:

بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ اِنِّیْ لَفِیْ شَاْنٍ وَاِنَّكَ لَفِیْ شَاْنٍ۔ (ایضاً)

ترجمہ: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں میں کس حال میں ہوں اور آپ کس حال میں۔

خلاصہ اس بیان کا یہ نکلا کہ نماز تمام عبادات سے افضل و اعلیٰ اور نماز کے ارکان میں سجدہ رکن اعظم اور قرب خداوندی کی زیادتی کا سبب ہے اور سجدہ میں دعا کی کثرت اور جد و جہد کا حکم ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جزو اعظم و اغلب پر کل کا اطلاق ہوجاتا ہے۔ تو اس اعتبار سے بطور مجاز **الدعاء هو العبادة** فرمانا بالکل حق اور صحیح ہوگا۔ گو حقیقت کے اعتبار سے دعا عبادت کا مغز اور ثمرہ ہے۔

جواب کی دونوں تقریروں سے اصل شبہ کا قلع قمع ہوجاتا ہے۔ خواہ جواب اوّل کے موافق دعا کو عین عبادت اور دعا کو عبادت کا مغز و ثمرہ دو حیثیتوں سے حقیقی معنی میں کہا جائے۔

دوسرے جواب کے موافق دعا کو حقیقتاً عبادت کا مغز کہا جائے اور بطور مجاز کے اس کو عین عبادت کہہ دیا جائے۔ گو یہ شبہ اتنا قوی نہ تھا کہ اس کے جواب میں اس قدر تفصیل کی جاتی۔ مگر جواب کی تقریر میں بہت سے فوائد کے حصول کی توقع تھی اس لیے اس قدر توضیح و تشریح کو مناسب سمجھا۔

اجابت وتاثیرِ دعا

دعا میں اجابت وتاثیرِ دعا کی بحث بڑی معرکہ کی ہے اس سے تو غالباً کسی کو انکار نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ نے دعا کا حکم دیا ہے بندوں کو اس کی تعمیل کرنی چاہیے۔ اور اس سے بھی انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ بسا اوقات دعا کے بعد مطلوب کا حصول ہو جاتا ہے جس کو قبولیتِ دعا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بحث صرف اس بات میں ہے کہ دعا کو قبولیت میں کچھ دخل وتاثیر ہے یا نہیں۔ یہاں پہنچ کر فلسفۂ الٰہی اور فلسفۂ انسانی میں کشمکش ہوتی ہے کہ فلسفۂ انسانی کے متبع اور اپنی عقل ناقص و ناتمام کو کامل وصحیح سمجھنے والے دعا کی تاثیر کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دعا کو مدعا کے حصول میں کیا دخل ہے۔

لیکن فلسفۂ الٰہی میں یہ بات یقینی اور محقق ہے کہ دعا مؤثر ہے۔ دعا کی تاثیرات عالم میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور اسی بنا پر شریعت نے حکم دیا ہے۔ اس سے انکار کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسرار الٰہی کو اپنی عقل ناتمام کے تابع کر لیا ہے۔ روحانیات اور مؤثرات باطنی کو مادیات پر قیاس کر لیا گیا۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس بحث کا فیصلہ اس طرح کر دیں کہ کسی سلیم الطبع کو حق و باطل کی تمیز میں تردد باقی نہ رہے۔ اوّل ہم منکرین دعا کی دلائل وشواہد بیان کریں گے۔ اور اس کے بعد اصل حقیقت منکشف کی جائے گی۔ **واللہ الموفق**۔

منکرینِ اجابت وتاثیر دعا کے بیانات

اجابت وتاثیرِ دعا کے منکر زمانہ قدیم میں بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ جس قدر اعتراضات اجابت وتاثیر دعا پر کیے جاتے ہیں وہ سب پرانے ہیں۔ فلسفہ جدید کے ماہروں نے بھی کوئی نیا اعتراض پیدا نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ فرق کوئی نکال سکتا ہے تو طرزِ بیان اور اختلافِ ادا کا۔ اس سے زیادہ کوئی جدت نہیں ہے۔

اجابت وتاثیر دعا کے باطل اور لغو ہونے پر دو طریق سے استدلال کیا گیا ہے: ایک

اسلامی اور دوسرا غیر اسلامی، یعنی ایک طریقہ میں اسلامی اصول وعقائد کو چھوڑ کر اجابت دعا کا انکار کیا گیا ہے اور اس کو غیر معقول اور فطرت کے خلاف کہا گیا ہے۔ اور دوسرے طریقہ میں اسلامی اصول وعقائد کو تسلیم کر کے انھیں کی بنا پر اجابت دعا کو نا قابلِ تسلیم کہتے ہیں۔

غیر اسلامی طریقہ

اس طریقہ کا استدلال قانون قدرت یا اسباب ومؤثرات پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ ان کے لمبے چوڑے بیانات کا حاصل یہ ہے کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسباب سے علاحدہ ہو کر دنیا میں کسی چیز کا ظہور نہیں ہوسکتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک فطرت کے خلاف ذات کو مان کر تمام قوانین قدرت کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دینا اور فطری اسباب کو اس کے سامنے معطل و بیکار کر دینا یا اس کے حکم کا مطیع و فرماں بردار بنا دینا سراسر عقل کے خلاف ہے۔ یہ ساری باتیں مضحکہ خیز ہیں۔

یہ لوگ خدا کو مانتے ہیں، تو اسی قدر اختیارات میں اس کو دینا مناسب اور مطابقِ عقل سمجھتے ہیں کہ اس نے اولاً فطرت کو پیدا کیا اور اس کو قوانین کی زنجیر میں جکڑ دیا۔ اب جو کچھ ہوتا ہے ان قوانین کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ ذات جس نے فطرت کو پیدا کر کے قوانین کی زنجیر میں مقید کر دیا تھا۔ اب خود بھی ان قوانین کے خلاف ایک ذرّہ ہلا دے تو اس کے اختیار میں نہیں۔ گویا اس قول کے موافق جس فطرت کو بااختیار خود پیدا کیا تھا اور اس کو قوانین کے قیود میں مقید کیا تھا، اب خود بھی ان میں مقید ہو کر بے بس اور لاچار ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ دعا واجابتِ دعا محض لغو اور وحشیانہ فسانہ ہے۔ اجابتِ دعا جب ہی ہوسکتی ہے جب ایک فطرت کے خلاف (وجود قادر مطلق) ذات کو تسلیم کر لیا جائے۔ اور اس کو سلسلۂ اسباب کے درہم برہم کرنے کا اختیار بھی دے دیا جائے۔ اور یہ محض غیر معقول چیز ہے اور جب کوئی فطرت کے خلاف ذات نہیں ہے جس کو اس قسم کے اختیارات حاصل ہوں۔ کوئی ذات ہے تو اس قدر بااختیار کہ فطرت کو پیدا

کر کے اور اس کو سلسلۂ قوانین میں مقید کر کے اپنے سب اختیارات اس کے حوالہ کر دے۔ اور دور بیٹھے قوانین قدرت کا تماشا دیکھ رہی ہے تو اجابت دعا کو تسلیم کر لینا مضحکہ خیز امر نہیں تو اور کیا ہے۔ اس بات کو تو صدق اور راستی سے کچھ بھی سروکار نہیں ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک فطرت کے خلاف ذات جب چاہے فطرت کے خوشنما کاموں کا ستیاناس کر دے۔ اور جب چاہے بنا دے۔

وہ کہتے ہیں کہ دعا کی تاثیر وقوت سے جیسے کسی شہر کا تعمیر ہونا، یا ریاضی کا مسئلہ حل ہونا خارج ہے، ایسے ہی صحت و مرض، فتح وشکست، رزق و مال، خوشحالی وتنگدستی بھی خارج ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص خواہ اسے مذہب میں کتنا ہی غلو کیوں نہ ہو شہر کی تعمیر کے لیے خدا سے دعا کرنا تو محض بے نتیجہ اور لغو خیال کرتا ہے، لیکن وہ صحت و مرض، خوشحالی یا شادابی، فتح ونصرت وغیرہ کے لیے مفید مانتا ہے۔

یہ خلاصہ ہے اس تقریر کا جو فلسفہ وطبعیات کے جدید تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ غیر اسلامی طریقہ پر اس سے زیادہ کوئی قوی دلیل اجابت دعا کے بطلان اور لغویت پر نہیں بیان کی جاسکتی۔

اسلامی طریقہ پر انکارِ اجابتِ دعا

اسلامی اصول کو مان کر اجابت دعا کے بطلان پر کئی طرح سے تقریر کی جاسکتی ہے۔ اوّل یہ ہے کہ اسلامی اصول وعقائد کے موافق خدا تعالیٰ کا علم قدیم ازلی ہے۔ تمام کائنات اور زمانہ کے حوادث کا ازل سے ابد تک اس کو علم صحیح حاصل ہے۔ جس میں کسی قسم کے تغیر وخلاف کا احتمال نہیں ہے۔ اور یہ امر بھی اصول اسلام میں مسلم ہو چکا ہے کہ جس چیز کے وقوع کا علم خدا تعالیٰ کو ہے اس کا وقوع واجب ہے۔ ورنہ اگر اس کا وقوع نہ ہوا تو خدا تعالیٰ کا علم قدیم غلط ہو جائے گا۔ اور جس چیز کے عدم وقوع کا علم ہے اس کا وقوع ممتنع ومحال ہے۔

جب یہ دونوں امر مسلّم ہیں تو اب دعا کا کیا فائدہ؟ خدا تعالیٰ کے علم میں اس

مطلوب بالدعا کا اگر واقع ہونا ہے تو دعا کرے یا نہ کرے ہو کر رہے گا اور اگر خدا تعالیٰ کے علم میں نہ ہونا ہے، تو دعا سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔

دویم یہ کہ اسلامی اصول کے موافق خدا تعالیٰ نے عالم کو پیدا کرنے سے بہت پہلے کائنات کے تمام حوادث کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اس نے جو مقدر کرنا تھا کر دیا ہے۔ اب دعا کیا کر سکتی ہے اگر دعا کو اتنا قوی مان لیا جائے کہ قضاء الٰہی اور تقدیر خداوندی کو ہٹا دے تو بالکل باطل اور ظاہر البطلان ہے۔ اس طرح تو خدا کی خدائی ہی باطل ہو جاتی ہے۔

تقریر اوّل و دویم میں یہ فرق ہے کہ اوّل تقریر کا مدار تو علم پر تھا۔ اور دوسری کا تقدیر پر، حاصل دونوں کا ایک ہے۔

سویم دعا کے ذریعہ جو چیز طلب کی جاتی ہے، دو حال سے خالی نہیں، یا دعا کرنے والے کی مصلحت کے موافق ہوگی جس کا انجام اس کے لیے بہتر و مفید ہوگا۔ یا اس کی مصلحت کے مخالف اور نتیجتاً مضر ہوگی اور یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ نے بندوں کی مصلحتوں کی پوری رعایت رکھی ہے پھر دعا سے کیا فائدہ اور کیا نفع ہے۔ اگر مطلوب بالدعا اس کی مصلحت کے موافق ہے تو خدا تعالیٰ خود کرے گا۔ اور مخالف ہے تو بندہ کو ایسی چیز کا طلب کرنا جائز نہیں ہے۔

اسلامی طریقہ پر دعا و اجابت کے انکار کے متعلق اور بھی اعتراضات ہیں، مگر ہم فقط ان تین ہی تقریروں پر اکتفا کرتے ہیں۔ سب میں زیادہ قوی یہی ہیں۔

اجابت و تاثیرِ دعا کا اثبات اور معترضین کے جوابات

جس طرح ہم نے منکرینِ اجابت کے اسلامی وغیر اسلامی استدلال کو جدا جدا بیان کیے ہیں۔ اسی طرح ان کے جوابات کو بھی جدا جدا لکھنا چاہتے ہیں۔

غیر اسلامی طریقہ کے استدلال کا حاصل تو صرف یہ ہے کہ یہ معترض دراصل خدا کی خدائی کا منکر ہے۔ کیوں کہ وہ عالم اور اس کے تمام حوادث و کائنات کو فطرت کے

سپرد کرتا ہے اور فطرت کو بھی قوانین کی زنجیر میں جکڑ کر اسے بھی بے اختیار کہتا ہے۔
خدا کی ذات کو مانتا ہے تو صرف اتنا ہی کہ اس نے فطرت کو پیدا کر دیا لیکن فطرت کے اختیارات میں اس کو کچھ دخل نہیں ہے۔ اسی بنا پر یہ قائل نہ صرف دعا واجابتِ دعا کے، بلکہ معجزات اور خوارق اور تمام ایسے امور کے جوان کے نزدیک قوانینِ قدرت یا اصول فطرت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، منکر ہیں، اس وجہ سے حقیقت میں یہ ان کا اختلاف دعا واجابتِ دعا کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ خدا کے وجود اور اس کی صفات میں ہے۔ اور اب تاوقتیکہ ہم خداوند قادر و با اختیار اور صفات کمال سے متصف ذات کی ضرورت کو ثابت نہ کریں اس مسئلہ کا حل نہیں ہوسکتا۔
اور چوں کہ یہ مسئلہ بجائے خود محقق و مدلل ہو چکا ہے اس لیے یہاں لکھنے کی حاجت بھی نہیں رہی۔ اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ جن لوگوں کی سمجھ میں خدائے قادر و برتر کا وجود نہیں آتا وہ اس کو فطرت کے خلاف سمجھ کر چھوڑ بیٹھے۔ اور مانا تو صرف اس قدر مانا کہ اس نے فطرت کو پیدا کیا اور فطرت نے قوانین کے دائرہ میں رہ کر عالم کا نظم ونسق کیا۔ حقیقت میں بہت سی حماقتوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کو ایسی ذات کے ماننے کی بھی کیا ضرورت ہے جو فطرت کو پیدا کرے اگر فطرت ہی کو خدا کا قائم مقام مان لیں اور اسی پر خدائی کا نام رکھ دیں تب بھی وہی کام چلتا ہے، جو ایسے اپاہج اور بے اختیار خدا کو ماننے سے چلتا تھا۔ پھر ایسے خدا کو مان لینا عقل اور فطرت کے خلاف ہے یا نہیں۔ غرض حاصل اس کا یہی نکلتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک خدا کی ضرورت نہیں ہے تو اب ان سے بحث خدا کے وجود میں ہونی چاہیے۔ نہ کہ دعا واجابتِ دعا میں اس لیے اس بحث کو ہم یہیں چھوڑ کر دوسرے طرز سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔
ہم کہتے ہیں کہ اگر بالفرض یہی مان لیا جائے کہ سلسلۂ اسباب سے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی ذات ایسی نہیں ہے جو اپنے اختیار سے فطری اسباب کو درہم برہم کر دے یا کر سکے تب بھی دعا واجابت دعا کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔
ہم پوچھتے ہیں کہ کیا سلسلۂ اسباب فقط مادیات ہی میں منحصر ہے۔ یا روحانیات

میں بھی جاری ہوسکتا ہے۔ اور پھر مادیات کا سلسلۂ اسباب سارا کا سارا محسوس ومشاہد ہے۔ یا کچھ اسباب اور اسباب کے اسباب ایسے بھی ہیں، جن کا ادراک حواس سے نہ ہو، بلکہ عقل سے ہوتا ہو۔

میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہ کرے گا کہ مادیات کا سلسلۂ اسباب سب کا سب حواس ظاہرہ سے معلوم ہوسکتا ہے۔ یا سارے سلسلہ کا ہم کو عقلی طور پر علم حاصل ہوچکا ہے۔ علوم جدیدہ اور جدید انکشافات نے بھی اس دعویٰ کی اجازت نہیں دی کہ ایک واقعہ وحادثہ کے بھی تمام سلسلۂ اسباب پر کسی ایک کا علم محیط اور حاوی ہوچکا ہے۔

جب مادیات میں ہمارا یہ حال ہے تو روحانیات کے متعلق ہمارا کوئی قول کیوں کر قابلِ تسلیم ہوسکتا ہے۔ روحانیات تو خود ہی محسوس نہیں ہیں۔ ان کے اسباب کیسے محسوس ہوسکتے ہیں۔ اور اسباب کے اسباب اور علّتوں کی علّت تک ہماری رسائی کیسی ہوسکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ ہم روحانیات کو تسلیم کرکے ان کے اندر سلسلۂ اسباب کے قائل نہ ہوں یہ سراسر حماقت وجہل ہوگا۔ اور روحانیات کا سرے سے انکار کرنا اس سے بھی بڑھ کر جہل وحماقت سمجھا جائے گا۔

جب یہ باتیں تسلیم ہوچکیں تو ہم کہتے ہیں کہ دعا کو بھی منجملۂ اسباب ایک سبب مان لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اس صورت میں بقول ان مدعیان عقل کے سلسلۂ اسباب برابر قائم رہے گا۔ اور کوئی ایسی بات ان کو ماننی نہ پڑے گی، جو ان کے نزدیک قوانینِ قدامت کے خلاف ہے۔ یا جس کا تعلّق ان کے خیال میں فطرت کے خلاف ذات سے ہے۔ غرض قوانینِ قدرت کے ماننے والوں کو جو ان قوانین کے حدود میں خدا کا دخل دینا بھی جائز نہیں سمجھتے اپنے ہی اصول پر قائم رہ کر تاثیر دعا سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فرق ہوگا تو صرف اتنا کہ ہم دعا کے اثر کو اجابت دعا سے تعبیر کریں گے۔ اور اس کو خدا کا فعل اختیاری جانیں گے۔

اور یہ لوگ اس کو اس سبب کی تاثیر سمجھیں گے۔ لیکن جب اس اثر کو اجابت سے تعبیر کردینے میں کوئی حرج نہیں تو دعا کی اجابت کو مان لینے میں بھی انھیں کے قواعد کی

رو سے کچھ حرج نہ ہوگا۔

اگر ہم پر یہ اعتراض کیا جائے کہ دعا کو منجملۂ اسباب مان لینا اور اجابت دعا کو اس کا اثر وثمرہ کہنا فطرت کے خلاف ہے۔ اس بات کو عقل ہرگز باور نہیں کرسکتی کہ کوئی شخص زبان سے یا محض دل سے سوال کرتا ہے اور خدا کے سامنے اپنی حاجتیں اور ضرورتیں پیش کرتا ہے اور وہ ان کا تعلق اسباب سے مانتا ہے۔ بلکہ جہاں تک خیال کیا جاتا ہے اور معتقدینِ دعا کے اعتقادات کو دیکھا جاتا ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسباب سے قطع تعلق کا نام دعا ہے۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ باطنی اسباب کے تعلّقات ان کی ترتیب اور ان کے آثار وثمرات چوں کہ محسوس نہیں ہیں اور ان کے کنہ وحقیقت تک عقلوں کی رسائی بھی نہیں ہے۔ اگر ہوسکتی ہے تو انھیں کو جن کی عقلوں کے لیے ایمانی فراست رہبر ہے یا جن پر خدا تعالیٰ نے باطنی حقائق کو منکشف فرما دیا ہے۔ اس لیے ہم اس کو محسوس و مشاہد کر کے تو نہیں دکھلا سکتے۔ البتہ نظائر وشواہد سے بتلا سکتے ہیں۔ دیکھیے ابر آتا ہے۔ بارش ہوتی ہے۔ یہ دونوں باتیں ہمارے مشاہدہ میں آتی ہیں جب ہم اس کے اسباب کے درپے ہوتے ہیں تو عقل کی رہبری سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ بادل بن جاتے ہیں۔ اور ان سے پانی برستا ہے۔ یہ سبب بھی محسوسات میں داخل ہے لیکن اس سبب کی تاثیر کیوں کر ہوئی۔ اور اس سبب اور اس کے اثر میں کتنے اسباب وعلتوں کا دخل ہے۔ یہ سب ہمارے احساس ومشاہدہ سے غائب ہیں محض ان دونوں باتوں کو دیکھ کر ہم نے یہ رائے قائم کرلی ہے۔

علیٰ ہذا فقیر وحاجت مند غنی ومالدار سے سوال کرتا ہے۔ غنی اگر بخیل ہے تو اس کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ سخی ہے تو اس کے اندر ایک قسم کی حرکت وحمیت پیدا ہوتی ہے جو اس کو سائل کی حاجت رفع کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ نہایت سرور وخوشی کے ساتھ اپنے مال کو خرچ کرتا ہے۔ اس حالت وحرکت کو اریحیۃ کرم (سخاوت وکرم کا نشاط) کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سائل کی طرف سے سوال اور دوسری جانب مال کا وجود

اگر کافی ہوتا تو سخی و بخیل دونوں سے ایک ہی فعل صادر ہوتا مگر نہیں۔ اس کے ساتھ اس تحریک وحرکت کی بھی ضرورت تھی جس سے مال کا خرچ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ بخیل میں اس کی قابلیت نہ تھی، اس لیے کچھ اثر نہ ہوا۔ اور سخی میں قبول کرنے کا مادہ موجود تھا، اس پر آثار ظاہر ہوئے۔ لیکن اگر کوئی شخص مالدار بھی ہو سخی بھی ہو۔ کسی پر مہربان بھی ہو مگر حاجت مند کی جانب سے سوال وطلب حاجت کے بجائے اعراض ونفرت و کراہت کا اظہار ہو تو جو استعداد معطی کی جانب موجود تھی اس میں بجائے حرکت کے اور سکون و جمود پیدا ہوجاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حاجت مند زبان سے بھی سوال نہیں کرتا۔ مگر اس کی حالت خود اس کی حاجت وسوال کو ظاہر کردیتی ہے۔ تب بھی سخی کے دل میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس کی حاجت رفع کرنے کی طرف مائل کردیتی ہے۔

سائل کا سوال یا حاجت مند کی حاجت سبب ہے سخی کی سخاوت وکرم کا۔ اور یہ بھی بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح کہ زمین سے بخارات نکل کر بادل بارش کے سبب بن جاتے ہیں۔ دردمند اور حاجت مند کے دل سے مایوسی ومجبوری کی حالت میں بخارات نکلتے ہیں۔ جو سخی کے دل میں بادل کی صورت پیدا کردیتے ہیں۔ اور اس سے سخاوت کی بارش برسنے لگتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں فرق ظاہر ہے۔ زمین سے بخارات کا نکلنا بادل کی صورت کا نمودار ہونا بارش کا برسنا سب محسوس ہیں۔ لیکن دردمند کے دل سے حاجت وطلب کے بخارات کا نکلنا خصوصاً جبکہ وہ زبان سے بھی کچھ نہ کہے۔ اور کریم و جواد کے دل میں ابرِ کرم کی صورت پیدا کرلینا اس کا تعلّق مشاہدہ واحساس سے بہت دُور ہے۔

صرف علم ہے تو آثار کا۔ لیکن اتنی بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ سببیت و مسببیت کی علامت یہاں بھی موجود ہے۔

اسی طرح اگر ہم یہ کہیں کہ دعا خواہ زبان سے ہو یا حال سے وہ سبب ہے اسباب باطنہ کے اندر حرکت پیدا کردینے کا۔ جس کو اہلِ ملت و مذہب تو اس سے تعبیر کریں

گے کہ سائل کا سوال وسائل کی حالت سبب ہوگئی خداوند مختار وقادر کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے اور یہ پیروان فلسفہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسباب باطنہ میں اس کے سبب حرکت پیدا ہوگئی اور اس سے ان آثار کا ظہور ہوا۔ تو بہر حال دعا کی تاثیر و ثمرات سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

البتہ یہ اعتراض ان لوگوں کی جانب سے کسی قدر قوی معلوم ہوتا ہے کہ جب خدا کو اس طرح قادر اور مختار مان لیا کہ وہ اپنے اختیار سے سلسلۂ اسباب کو درہم برہم کرسکتا ہے تو پھر دعا کے اندر یہ فرق کرنا کہ کسی شہر کے خود بخود بن کر کھڑے ہوجانے کی دعا کو تو غیر مفید سمجھتے ہیں۔ اور صحت و مرض وغیرہ امور کے بارے میں دعا کو مؤثر و مفید سمجھتے ہیں، کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

دعا اگر مؤثر ہے تو ہر جگہ ہے خدا تعالیٰ کو قوانین قدرت میں مداخلت کا اختیار ہے تو ہر بات میں ہوسکتا ہے یہ فرق کیوں اور کس وجہ سے ہے۔ حالاں کہ دعا و اجابتِ دعا کو حق اور صحیح تسلیم کرنے والے بھی اس کو مفید نہیں سمجھتے کہ ایسے امور کے بارے میں جو خلاف عادت ہوں دعا مانگی جائے۔

لیکن حقیقت میں یہ شبہ ہی بالکل مہمل اور لغو ہے اس کی بنیاد صرف یہ ہے کہ وہ دعا کی حقیقت و حکمت اور مصلحتوں کو نہیں سمجھے۔ اگر وہ اس کو سمجھ لیتے تو ہرگز اس شبہ کو زباں پر بھی نہ لاتے اس کی حقیقت کو واضح و روشن کرنے کے لیے دو ایک بات بطور تمہید بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) اسلامی اصول و عقائد کے موافق خداوند عالم سلسلۂ اسباب کا مقید نہیں ہے اسباب بھی اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔

(۲) عالم میں جو حوادث و واقعات پیدا ہوتے ہیں یا جن کا پیدا ہونا ممکن ہے سلسلۂ اسباب میں منسلک مان لینے کے باوجود تین قسم کے ہیں۔

ایک وہ جو بکثرت ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً صحت، مرض، خوشحالی، تنگدستی، ولادت، موت، بارش یا خشک سالی وغیرہ۔

ایک وہ جو شاذ و نادر ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً آسمان سے پتھروں کا برسنا وغیرہ۔
ایک وہ جو ممکن اور سلسلۂ اسباب میں منسلک ہونے کے باوجود کبھی بھی ظاہر نہ ہوں اگر ہوں تو صرف اس وقت جبکہ خداوند عالم کو کرشمۂ قدرت دکھلانا یا اپنے کسی خاص اور مقبول بندے کی تصدیق کرنا ہو۔ مثلاً اسلام اور تمام آسمانی مذہبوں کے اعتبار سے نظام عالم کا درہم برہم ہوجانا، پہاڑوں کا زمین کے برابر ہوجانا وغیرہ وغیرہ۔
کسی کا یہ دعویٰ کرنا تو مشکل ہے کہ قیامت کا قائم ہونا اور نظام عالم کا درہم برہم ہونا سلسلہ اسباب سے خارج ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے لیے بھی ایسے اسباب ہوں جن پر اس کا ترتب ہوا ہے۔ اور اسلامی اصول سے ایسے اسباب کا پتہ بھی چلتا ہے۔ لیکن ان اسباب کا ظاہر پر نظر رکھنے والی عقلوں کو ادراک ہونا محال و دشوار ہے۔ یا مثلاً انبیا کے معجزات کہ اگرچہ بظاہر سلسلۂ اسباب کے خلاف ان چیزوں کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسی کم عقل کے نزدیک جو اسباب کو ایک ہی نوعیت اور سلسلہ میں منحصر کردے۔ جس کو اسباب کی تاثیر کو روکنے والے یا علّت تامہ کے جز واخیر کا علم نہ ہو۔
یہ چیزیں ان خاص بندوں کی تصدیق کے لیے ظاہر کی جاتی ہیں جو خدا کے بھیجے ہوئے اور اس کے قائم مقام بن کر دنیا میں آتے ہیں۔ ان کو اختیارات بھی وہی دیے جاتے ہیں، جن میں عام مخلوق حصہ دار نہیں۔
(۳) عبدیت ایک تعلق ہے جو عبد اور معبود کے درمیان ہوتا ہے۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ عبد کو معبود کے ساتھ خاص تعلّق ہو۔ اور وہ ہر آن ہر حال میں اپنے کو عبد و مخلوق اور اس کو معبود و خالق سمجھے اعطا و منع، اعدام و ایجاد، نفع وضرر کا مالک و مختار اسی کو جانے۔ اور اسی وجہ سے مقام عبدیت کو قائم رکھنے کے لیے بندے کا خوف وامید میں رہنا ضروری ہے۔ بندہ اگر اپنے آپ کو مستقل بے نیاز سمجھنے لگے تب بھی بندگی سے خارج ہوجاتا ہے اور اس کی طرف سے بالکل مایوس و ناامید ہوجائے اور کسی قسم کی توقع اس سے نہ رکھے تب بھی۔
جب یہ امور بیان ہو چکے تو اب سنیے کہ خدا تعالیٰ نے عالم کو پیدا کر کے اس کے

لیے سلسلۂ اسباب بھی پیدا فرما دیا ہے اور انسانوں کو حکم دے دیا ہے کہ تم ان اسباب کے ذریعہ اپنے مقاصد کو حاصل کیا کرو لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا ہے کہ کسی حال میں ہم کو نہ بھولو۔ اسباب سے کام لیتے وقت بھی ہمیں کو فاعل و مختار سمجھو اور یہ بھی نہ کرو کہ ان اسباب کو بالکل ترک کر دو اور ہمارے قائم کردہ سلسلہ کو لغو و بیکار سمجھو۔ صرف ہماری قدرت و اختیار پر بھروسہ کر کے اپاہج بنے بیٹھے رہو اور ظاہر ہے کہ دونوں باتوں کا سنبھالنا مشکل ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسباب کے ذریعہ ہمارا مقصد پورا ہوتا ہے۔ کھیتی کرتے ہیں تو غلہ پیدا ہوتا ہے۔ دوا کرتے ہیں تو صحت ہوتی ہے۔ علم حاصل کرتے ہیں تو عالم بن جاتے ہیں۔ اینٹ چونا فراہم کرتے اور فن انجینئری و معماری کا لحاظ کر کے تعمیر کرتے ہیں تو مکان بنتا ہے۔ پیادہ یا گاڑی گھوڑے ریل پر سفر کرتے ہیں تو منزل مقصود تک پہنچتے ہیں اور پھر جیسے اسباب ہوتے ہیں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ بیج کو ڈال کر اگر سینچتے اور کھاد بھی ڈالتے ہیں تو غلّہ زیادہ پیدا ہوتا ہے اور اگر محض بارش کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو کبھی پیدا ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔

ریل میں سوار ہوتے ہیں تو جلد پہنچتے ہیں۔ گھوڑے پر جاتے ہیں تو بہت دیر میں وعلیٰ ہذا اور پھر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کی عقل و ادراک محسوسات سے آگے قدم نہیں رکھتی۔ تو ایسی حالت میں بالکل ممکن ہی نہیں بلکہ مشاہد ہے کہ آدمی ان اسباب پر ایسا مغرور ہو جاتا ہے کہ اس کو بھول کر بھی کبھی خالق و مالک اور مسبب الاسباب کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا۔ عالم میں خدا کے وجود کا جتنی قومیں منکر ہوئی ہیں وہ انھیں اسباب پر مغرور ہو کر ہوئی ہیں۔

اور جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے اختیار و مشیت سے ہوتا ہے۔

لاتتحرك ذرة الّا باذنه۔

ایک ذرہ بھی بغیر اس کی اجازت کے حرکت نہیں کرسکتا۔

اور انسان میں خوبیوں کے ساتھ برائیاں بھی خلقتاً ودیعت رکھی گئی ہیں تو ایسی حالت میں وہ اسباب اور کسب ذرائع کو چھوڑ بیٹھنے پر آمادہ ہوجاتا ہے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسباب کچھ نہیں کر سکتے۔ جو کچھ کرتا ہے مسبّب الاسباب کرتا ہے۔ ہم کو اس لڑائی اور جھگڑے میں پڑنے سے کیا فائدہ۔ جس کا نتیجہ ایک جانب تو یہ ہوگا کہ خداوند عالم کو نظام عالم سے جو مقصود ہے۔ وہ فوت ہوجائے گا۔ دوسری جانب انسان کی کاہلی وسستی یہاں تک بڑھ جائے گی کہ وہ فرائض کی ادائیگی اور حقوق خداوندی سے بھی غافل ہوجائے گا۔ اور وہاں بھی اس قاعدہ کو جاری کرے گا کہ یہ اسباب نجات کا ذریعہ ضرور ہیں۔ مگر نجات دینے والا قادر مطلق ومختار ہے۔ اسباب کیا کر سکتے ہیں۔

اس مشکل حالت کو سنبھالنے اور توازن کو قائم رکھنے کے لیے مخلوق کو مقام عبدیت پر قائم رہنے کی تعلیم دی ہے کہ جب اسباب کے ذریعہ کسب کرو تو اسباب پر اعتماد نہ کرو اور ان اسباب میں بھی ہمیں ہی فاعل سمجھو صحت کے لیے دوا کرو تو شافی خدا کو سمجھو، دوا کو مؤثر حقیقی سمجھ کر اس پر اعتماد نہ کرو۔ اور یہ بھی نہ کرو کہ جن چیزوں کا وجود بغیر اسباب کے نہیں ہوتا اگرچہ باعتبار قدرت خداوندی ممکن ہو۔ خدا کی قدرت پر اعتماد کر کے اسباب کو ترک کر بیٹھو۔ جس طرح اسباب کو مؤثر حقیقی سمجھ کر ان پر اعتماد کر لینا اور خدا اور اس کی قدرت واختیار کو درمیان سے نکال ڈالنا شرک ہے۔ جیسے کہ آج کل کے دہریئے وفلسفیوں کا خیال ہے۔ ایسے ہی اسباب کو بالکل لغو اور بیکار سمجھ کر معطل ہو کر بیٹھنا بھی حرام ہے۔ روٹی سامنے رکھی ہو۔ بھوک بھی لگ رہی ہو، لیکن یہ سمجھ کر کہ خدا اپنی قدرت سے روٹی پیٹ میں ڈال سکتا ہے۔ لقمہ نہ توڑے اور بھوکا مرجائے تو شریعت میں یہ موت حرام کی موت ہے۔ وہ شخص عاصی وگنہگار ہے۔ ایسے ہی کسی شخص کے پاس سردی وگرمی سے محفوظ رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور اس کے پاس مکان تعمیر کرنے کی طاقت ہے۔ یا کرایہ پر مکان لے کر رہ سکتا ہے۔ مگر وہ نہ مکان لیتا ہے نہ باوجود استطاعت کے تعمیر کرتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے وہ مکان بنادے گا۔ اور اس طرح اپنی حفاظت کے اسباب موجود ہونے

کے باوجود تکلیف اٹھا کر جان دے دے تو یہ بھی حرام ہے۔

جب یہ معلوم ہوگیا تو اب سنیے کہ دعا کی تعلیم جو خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دی ہے اس سے بھی مقصود مقام عبدیت پر قائم رکھنا ہے۔ آدمی جب کسب ومحنت میں مشغول ہوتا ہے اور اسباب کو مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ کر اس میں مشغول ہوتا ہے تو ضرورت ہے کہ ایسی حالت میں اپنا تعلق خدا کے ساتھ قائم رکھے۔ دعا سے اس تعلق کا اظہار ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ سب کچھ اپنے اختیار سے کر رہا ہے۔ مگر دل سے یہی سمجھتا ہے کہ میرے کرنے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اسباب ہرگز مجھ کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ مؤثر حقیقی صرف حق تعالیٰ ہے۔ اور زبان سے بھی اس کا اقرار کرتا ہے۔ اور یہی دعا ہے۔ لیکن ایسی چیزوں کے لیے دعا کرنا جو بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتیں۔ جیسے روٹی سامنے رکھ کر بغیر لقمہ توڑے یہ دعا کرنا کہ الٰہی پیٹ بھر دے اس دوسری صورت میں داخل ہوگا، جس کی ممانعت ہے۔

ہمارے اس بیان سے خوب ظاہر ہوگیا کہ دعا کی تعلیم اسی حکمت کی وجہ سے ہے اور یہ وہ حکمت ہے جس کے سمجھنے سے دہری وفلسفی عاجز ہیں ؎

چند خوانی حکمت یونانیاں
حکمت ایمانیاں راہم بخواں

اس موقع پر کوئی شخص توکل کی بحث کو پیش نہ کرے کہ مسلمانوں کے مذہب میں توکل نہایت عمدہ چیز ہے۔ ان کو توکل کی تعلیم دی گئی ہے اور توکل اسباب وذریعہ کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ کیوں کہ توکل کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد کوئی خلجان باقی نہیں رہ سکتا۔ مگر چوں کہ یہ موقع توکل کے بیان کا نہیں ہے۔ اس لیے ہم زیادہ بیان کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ توکل بھی ان امور میں جاری ہوتا ہے جن میں دعا کی اجازت یا حکم ہے۔ کھانا سامنے ہونے کے بعد صرف توکل کر کے بیٹھا رہنا اور لقمہ منہ تک نہ لیجانا ہرگز توکل نہیں ہے۔ علی ہذا تحصیل علم کی طرف مائل نہ ہونا اور توکل کر کے بیٹھا رہنا کہ خدا کو منظور ہوگا تو عالم ہو جائیں گے توکل میں داخل نہیں۔

باوجود استطاعت کے تعمیر نہ کرنا اور یہ سمجھ لینا کہ اس کو منظور ہوگا تو خود بخود بن جائے گا توکل نہیں ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ ہماری مذکورہ بالا تقریر کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے گی۔ واللہ الموفق۔

اسلامی اصول کے موافق دعا واجابت دعا کے انکار پر تین دلائل بیان کیے گئے ہیں۔جن میں اوّل کا حاصل تو یہ ہے کہ جب خدا کا علم قدیم ہے۔اور علم خداوندی کے خلاف عالم میں کچھ نہیں ہوسکتا تو دعا کا کوئی فائدہ نہیں ہے اگر مقصود بالدعا علم خداوندی کے موافق ہے،تو ہوکر رہے گا دعا کا کیا اثر ہے۔علم کے خلاف ہے تو ہرگز نہ ہوگا دعا سے کیا فائدہ۔اور دوسری کا حاصل یہ ہے کہ تقدیر کے خلاف دعا سے کچھ نہیں ہوسکتا، پھر دعا کا نتیجہ اور کیا فائدہ۔تیسری کا حاصل یہ ہے کہ مطلوب بالدعا بندے کی مصلحت کے موافق ہے تو بلا دعا بھی خدا اس کو کرے گا۔مصلحت کے خلاف ہے تو ایسی دعا جائز نہیں ہے۔

ہم اس موقع پر تینوں کا جواب عرض کرنا چاہتے ہیں۔مگر دلیل اوّل و دویم کا حاصل ایک ہے فرق ہے تو صرف اتنا کہ دلیل اوّل میں مدار علم خداوندی ہے۔اور دوسری میں مدار تقدیر ہے۔اسلامی فرقوں میں جو فرقہ تقدیر کا منکر ہے اس پر تو اوّل دلیل سے اعتراض وارد ہوسکتا ہے۔اور جو تقدیر کے قائل ہیں ان پر دونوں تقریروں سے اعتراض وارد ہوگا۔مگر چوں کہ جواب کا خلاصہ ایک ہے اس لیے دونوں کا جواب ایک ہی جگہ دیا جاتا ہے۔

ہم کہتے ہیں یہ بیشک تسلیم ہے کہ خدا تعالیٰ کا علم قدیم ہے اور علم خداوندی کے خلاف کسی چیز کا وقوع وظہور ناممکن ہے لیکن اس سے دعا کا باطل ہونا لازم نہیں آتا۔

اوّل تو ہم کو خدا تعالیٰ کے علم کا حال معلوم نہیں۔کسی ایک واقعہ کے متعلق بھی ہم یہ نہیں بتلا سکتے کہ خدا تعالیٰ کا علم کیا ہے۔اور جب ہم کو یہ معلوم نہیں کہ خداوند عالم کا علم کیا ہے،تو یہ بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ مطلوب بالدعا علم خداوندی کے موافق ہے یا

مخالف اور دعا کا ہم کو حکم ہے تو ہم کو محض اس پر اعتماد کر کے کہ خدا کے علم کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا، کیوں کر ترک دعا کا ارتکاب جائز ہوگا۔

دویم یہ کہ علم خداوندی میں اگر یہی ہے کہ وہ دعا کرے گا اور اس کا مقصود حاصل ہوگا تو ایسی حالت میں بوجہ اس کے کہ علم خداوندی کے خلاف کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ دعا کرنا واجب اور ترک دعا حرام ہوگا اور مطلوب بالدعا کا ترتب دعا پر سمجھا جائے گا۔

سویم یہ کہ اگر علم خداوندی پر اعتماد کر کے دعا کو ترک کر دینا اور غیر مفید سمجھنا ضروری ہے تو یہی دلیل تمام اسباب ومسببات میں چل سکتی ہے بندہ کا کسی چیز کے سلسلہ میں حرکت کرنا اور کسب واکتساب میں مشغول ہونا غیر مفید ہوگا۔ مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ کھیت میں بیج ڈالنا اور اس کو پانی دینا غیر مفید ہے اس لیے کہ اگر خدا کے علم میں یہ ہے کہ غلّہ پیدا ہوگا تو ہو کر رہے گا۔ یہ شخص بیج ڈالے یا نہ ڈالے پانی دے یا نہ دے۔ دعا کی کیا خصوصیت ہے۔ جو لوگ دعا کو جائز اور مفید کہتے ہیں وہ اس کو مؤثر بھی جانتے ہیں۔ پھر اگر اس بات کے تسلیم کر لینے کے باوجود کہ خدا کے علم قدیم کے خلاف کسی چیز کا ظہور نہیں ہوسکتا۔ محنت وکوشش اور اسباب میں مشغول ہونا جائز ہے تو دعا کرنا بھی جائز ہے۔ اور اگر دعا کرنا ناجائز وغیر مفید ہے تو یہی حال اور چیزوں کا بھی ہے کوئی فرق نہیں ہے۔

یہی تینوں تقریریں اعتراض دویم کے جواب میں چل سکتی ہیں۔ بیشک خدا تعالیٰ نے عالم کو پیدا کرنے سے قبل ہی تمام چیزوں کے لیے سب کچھ لکھ دیا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اوّل تو ہم کو علم نہیں کہ کسی خاص معاملہ میں تقدیرِ خداوندی کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر مقدر یہی ہے کہ مطلوب بالدعا دعا کے بعد حاصل ہوگا تو دعا کرنا واجب ولازم ہوگا۔ سویم یہ کہ اگر کسی وجہ سے دعا کو ترک کر دینا چاہیے تو تمام اسباب کا یہی حال ہوگا۔

تیسری دلیل کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ مصلحت پر اعتماد کر کے دعا کو ترک کر دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ علم وتقدیر پر بھروسہ کر کے ترک کر دینا۔ دوسری یہ کہ بندوں کی

مصلحت بدلتی رہتی ہیں۔ایک وقت میں کوئی بات مصلحت کے خلاف ہوتی ہے۔اور دوسرے وقت وہی بات مصلحت کے موافق ہوتی ہے۔پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ جو چیز دعا سے قبل مصلحت کے ہوخلاف دعا کے بعد مصلحت کے موافق بن جائے۔

ایک قوی اشکال اوراس کا حل

تاثیر واجابتِ دعا کو حق تسلیم کر لینے میں ابھی ایک قوی اشکال باقی ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ یہ تو تسلیم کر لیا گیا کہ خدا تعالیٰ نے عالم کے تمام حوادث و واقعات ازل ہی میں لکھ دیے ہیں اور تقدیر خداوندی کے خلاف کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔نہ تقدیر بدل سکتی ہے۔نہ اس کو کوئی روک سکتا ہے۔لیکن ہم اہلِ اسلام کے عقائد میں جہاں دعا کو مفید اور مؤثر دیکھتے ہیں وہاں ان کے اعتقادات میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ دعا تقدیر کو ٹلا دیتی اوراس کو بدل دیتی ہے اور یہ دونوں عقیدے کسی طرح جمع نہیں ہوسکتے۔ ان میں سے ایک ہی صحیح اور واقع کے مطابق ہوسکتا ہے اگر تقدیر الٰہی نہیں بدلی جاسکتی تو عقیدۂ ثانیہ یعنی دعا تقدیر کو ٹلا دیتی ہے یقینا غلط ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ دعا تقدیر کو رد کرسکتی ہے تو عقیدہ اوّل غلط ہوجاتا ہے۔ان دونوں عقیدوں کا صحیح مان لینا، دو مخالف چیزوں کی صحت کو ایک ہی وقت میں تسلیم کر لینا ہے۔اور خود ان کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح موجود ہے۔

لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات)

ترجمہ: سوائے دعا کے تقدیر کو کوئی چیز نہیں پلٹ سکتی۔

اگر فقط یہی کہتے کہ دعا تقدیر کے موافق ہوجاتی ہے۔جسے یوں کہتے ہیں کہ تدبیر تقدیر کے موافق ہوگئی تو کچھ حرج نہ تھا۔مگر وہ اس کے قائل ہیں کہ دعا تقدیر کو رد کردیتی ہے۔پھر اس میں یہی نہیں کہ دونوں اعتقادوں کا صحیح ہونا محال ہے، بلکہ تقدیر کے رد ہوجانے میں اور بہت سی خرابیاں سر رکھنی پڑتی ہیں۔چوں کہ بیشمار روایات میں ہے کہ تقدیر کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا۔

ادھر جب تقدیر کے خلاف ہوا تو علم خداوندی غلط ہوا۔ اور جہل لازم آیا۔ غرض اس اعتقاد کو مان کر کہ دعا تقدیر کو رد کر دیتی ہے ایک قسم کی خرابی نہیں، سیکڑوں خرابیاں سر کھنی پڑتی ہیں۔ بلکہ خدا کی خدائی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اور جس خدا کے وجود کو بڑی جدوجہد اور محنت سے ثابت کیا تھا اس کو بہت آسانی سے انکار کرنا پڑ جاتا ہے۔ رہا ان کا یہ فرق کرنا کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں: ایک مبرم اور پکّی تقدیر جو کسی حال میں ٹل نہیں سکتی۔ دوسری معلق اور کچی تقدیر جو ٹل جاتی ہے۔ اور دعا کی وجہ سے وتقدیر ٹلتی ہے وہ معلق ہے مبرم نہیں۔ اور اس کو صحیح مان لینے میں نہ دو مخالف چیزوں کا جمع ہونا لازم آتا ہے نہ اور کوئی خرابی سر پڑتی ہے۔ بالکل بچوں کا کھیل اور عقل سے بالاتر ہے۔ یہ دل بہلانے کی باتیں اور نادانوں کو سمجھانے کے ڈھکوسلے ہیں۔ جن کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ وہ اشکال ہے جس کو زمانہ کے عقلمند لوگ نہایت جوش وخروش کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور جس پر ان کو فخر وناز ہے لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عقل ودانش کے دعویدار جو اپنی عقل ناقص کے بھروسہ پر احکام الٰہی کو بدلنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اور جو ہر حکم شرعی کو اپنی عقل کی ترازو سے تولتے ہیں کچھ بھی نہیں سمجھے۔ انھوں نے اپنی عقل کو باطل خیالات کے دائرے سے نکال کر ذرا بھی آگے قدم رکھنا نہ چاہا۔ وہ اپنی دَغا بازیوں اور مکاریوں سے احکام شرع کو بدلنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اس سے ان کی کم عقلی اور تنگ خیالی کا ثبوت ملتا ہے۔ ساری خرابی اور اشکال کی اصل جڑ یہ ہے کہ وہ تقدیر مبرم ومعلق کے فرق کو نہیں سمجھے۔ اگر وہ اس کو سمجھ لیتے اور تھوڑا سا غور کر لینے کے بعد سمجھ لینا کچھ دشوار نہ تھا تو نہ اشکال واقع ہوتا نہ ان کو اس درجہ دعا کے انکار کی جرأت ہوتی۔

سنیے عالم میں جس قدر حوادث ہوتے ہیں ان کا تعلق مسبب الاسباب نے اسباب سے کر دیا ہے۔ یعنی زید روٹی کھائے گا تو پیٹ بھرے گا۔ پانی پیئے گا تو سیراب ہوگا۔ کمائے گا تو مالدار ہوگا۔ علم حاصل کرے گا تو عالم ہوگا۔ سفر کی تکلیف اٹھائے گا تو

کامیابی ہوگی۔ زراعت کرے گا تو غلّہ پیدا ہوگا۔

یہ تقدیرِ معلق ہے۔ یعنی اگر کرے گا تو ثمرات مرتب ہوں گے۔ نہ کرے گا تو ثمرات مرتب نہ ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ ہوگا کیا اور ظہور میں کیا آئے گا؟ وہ ان اسباب سے کام لے گا اور ثمرات ظاہر ہوں گے۔ یا اسباب سے کام لینے کے باوجود ثمرات مرتب نہ ہوں گے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کے علم میں ہے اور وہ اس کو بھی باختیار خود مقدر فرما چکا ہے۔ یہ تقدیر مبرم اور قطعی ہے جس کے خلاف کسی سبب اور علت سے نہیں ہوسکتا۔ حاصل یہ ہوا کہ تقدیرِ معلق میں نتائج کا ظاہر ہونا اسباب کے اختیار کرنے پر معلق ہے۔ اس کا ہونا اور نہ ہونا اسباب کے ہونے اور نہ ہونے پر معلق کیا گیا ہے۔ اور اس میں کوئی چیز متعین نہیں ہے۔ اب اس نے کوشش و محنت سے کام لیا تو دوسری جانب یعنی نتائج کا ظاہر نہ ہونا جو کوشش نہ کرنے کی صورت میں لکھا ہوا تھا ٹل گیا۔ اور نہ کیا تو اوّل صورت یعنی نتائج کا ظاہر ہونا مفقود ہوگیا۔ رہی تقدیر مبرم وہ کسی حال میں نہیں بدل سکتی۔

یہی حال دعا کا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مقدر فرما دیا کہ زید اگر فلاں وقت فلاں کام کے لیے دعا کرے گا تو اس کا مقصود حاصل ہوجائے گا۔ اور وہ ناکامی جو اس کو تھی یا حاصل ہونے والی تھی ٹل جائے گی۔ نہ کرے گا ناکام رہے گا۔ یہ تو تقدیر معلق تھی۔ اور یہ بھی وہ مقدر کر چکا ہے کہ زید کو دعا کی توفیق ہوگی یا نہیں۔ اور وہ کامیاب ہوگا یا نہیں۔ یہ مبرم ہے جس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور یہ ایسا فرق ہے جس کا کوئی صاحب عقل انکار نہیں کرسکتا۔ اگر اس فرق کو نہ مانا جائے تو کارخانۂ عالم سارا کا سارا درہم برہم ہوجاتا ہے۔

لیکن یہ بات ہے تو اب یہ شبہ ہوگا کہ قضائے معلق کو رد کر دینا دعا کے ساتھ کیوں مخصوص ہے؟ یہ بات تمام اسباب میں جاری ہوسکتی ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ کسب و اکتساب تقدیر معلق کو رد کرسکتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اکثر اذہان وطبائع میں دعا بے حقیقت و بے اثر معلوم ہوتی ہے۔ وہ اسباب ظاہرہ کو تو مؤثر و منتج سمجھتے ہیں اور دعا کو محض ضابطہ پُری اور حکم خداوندی کی تعمیل جانتے ہیں۔ حالاں کہ دعا تمام اسباب سے زیادہ مؤثر سبب ہے۔ اسی پر عبدیت قائم ہے۔ اور اسی پر معبود کے تعلقات قائم رہتے ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس ارشاد سے یہ ہے کہ دعا سب سے زیادہ مؤثر ہے اس تقریر کے بعد ہم اگر ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لایرد القضاء الا الدعاء کے معنی دو طرح سے بیان کر دیں تو بالکل صحیح ہوں گے۔

قضا سے قضائے مبرم مراد ہو۔ اور حدیث کے معنی یہ ہوں کہ قضائے مبرم کو کوئی چیز رد نہیں کر سکتی اگر کر سکتی ہے تو دعا کر سکتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ دعا سے قضائے مبرم رد ہو جاتی ہے یا وہ رد ہو سکتی ہے، بلکہ دعا کی قوتِ تاثیر کا بیان مقصود ہے۔

یا قضا سے قضائے معلق مراد ہو۔ اور اس وقت خصوصیت دعا کی وجہ یہ ہوگی کہ قضائے معلق کو رد کرنے والے میں سے سب سے زیادہ قوی، سب سے زیادہ مؤثر دعا ہے یعنی اور اسباب کے پائے جانے پر مسبب کا نہ پایا جانا بہت ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسباب پر مطلوبہ ثمرات ظاہر نہ ہوں، لیکن دعا ایسی قوی مؤثر ہے کہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

جو لوگ مقصد کے ادا کرنے کے طریقوں اور بیان کے طرز کو جانتے ہیں فصحا و بلغا کے کلاموں سے واقف ہیں ان کو ہمارے مدعا کے سمجھنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جو اپنے باطل خیالات سے علاحدہ ہو کر روزمرہ کے محاورات پر نظر کریں ان کو اس مطلب کے سمجھ لینے میں کچھ اشکال نہیں۔

تاثیر و اجابت دعا کے بارے میں ہمارا بیان اگرچہ کسی قدر طویل ہو گیا۔ اور ہم نے ناظرین کا بہت سا وقت اس میں لیا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ اب کوئی خلجان باقی نہ رہے گا اور دعا و اجابت دعا کو اسلامی عقائد کے موافق مان لینے میں کوئی اشکال مانع نہ ہو گا۔

دعا کی حقیقت اور اس کی اجابت و تاثیر کے بیان سے بقدر ضرورت فراغت کے بعد اب ہم دعا کے دوسرے مراتب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

شرائط و آداب دعا

یہ بات تو بیان سابق سے ثابت ہو چکی کہ دعا مؤثر ہے۔ اور خداوند عالم جل جلالہ

کے دربار سے دعا کی قبولیت واجابت کا فرمان نازل ہو چکا ہے۔اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ دعا کے معنی طلب حاجت اورسوال کے ہیں۔تو اب نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی جب خدا تعالیٰ کے سامنے دست طلب پھیلائے تو اس درگاہ سے اجابت اس کی مدد فرمائے اور یہ شخص اپنے مدعا میں کامیاب ہو۔اور یہی وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو خلجان پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم بارہا دعا کرتے ہیں اور بسا اوقات خالی ہاتھ لوٹتے ہیں۔اجابت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔

لیکن حقیقت میں یہ خلجان صرف اس وجہ سے واقع ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بندہ کی جانب سے طلبِ حاجت اور دعا اور اس جانب سے وعدۂ اجابت کو کافی سمجھ لیا ہے۔ادھر خیال نہیں کیا کہ دعا کے مؤثر ہونے اور وعدۂ اجابت کے ساتھ کچھ شرائط و آداب، شریعت نے ایسے بھی بتلائے ہیں، جن کے بغیر دعا مؤثر نہیں ہوتی۔گویا حقیقت میں دعا پر دعا ہونے کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب کہ شرائط وآداب پائے جائیں۔اس لیے مناسب ہے کہ دعا کے آداب وشرائط کو بھی اس قدر بیان کر دیں جس کی ضرورت ہے۔

(۱) دعا سے پہلے تمام خطاؤں اور گناہوں سے توبہ کرے۔اور کھانا پینا اوڑھنا اس کا طیب وطاہر ہوتا کہ ظاہر اس کے حال کے مطابق ہو جائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ بندہ خدا تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر یاربّ کہتا ہے۔لیکن اس کی دعا کیوں کر قبول ہو سکتی ہے۔جب کہ اس کا کھانا پینا اور لباس سب حرام ہے۔

(۲) مطلب کے پورا ہونے میں جلدی نہ کرے۔اور دعا کرنا اس بنا پر نہ چھوڑے کہ میں نے دعا کی تھی قبول نہ ہوئی۔حدیث شریف میں آیا ہے۔

یُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ یَدْعُ بِاِثْمٍ وَلَاقَطِیْعَةِ رَحِمٍ مَالَمْ یَسْتَعْجِلْ۔

(مشکوٰۃ، کتاب الدعوات ص، ۱۹۴)

ترجمہ: بندہ کی دعا اس وقت قبول ہوتی ہے جبکہ معصیت کے کام کی دعا نہ کرے اور

کسی قرابت دار عزیز سے قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جبکہ قبولیت دعا میں جلدی نہ کرے۔

علی ابن منصور قدس اللہ سرہٗ سے کسی نے پوچھا۔ ہم دعا کرتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتی۔ فرمایا کہ قبولیت کے لیے بندہ کا گناہوں سے پاک ہونا شرط ہے۔ بعض علما سے سوال کیا گیا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے، جس کی وجہ سے دعا مقبول ہو؟ فرمایا تم پر ضروری ہے کہ کھانا اور لباس طیب و حلال ہو۔ سائل نے کہا اس زمانے میں یہ باتیں کیوں کر میسر آسکتی ہیں؟ فرمایا کہ جب دعا کرنا چاہو تو برہنہ ہو کر پانی میں گھس جاؤ۔ اور اس میں سے چند گھونٹ پی لو۔ یہ پانی لباس اور غذا بن جائے گا اور اس وقت دعا کرو آثار اجابت ظاہر ہوں گے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور مقصد میں کامیاب ہوا۔ (شرح شرعۃ الاسلام صفحہ ۱۶۳)

(۳) اپنے مطلب کا سوال بلا تردد کرنا چاہیے۔ اور سوال میں گریہ وزاری ہونا چاہیے۔ یہ نہ کہے کہ الٰہی چاہے تو میری مغفرت کردے یا مجھ کو میرا مطلوب عطا فرمادے۔ حدیث شریف میں ہے:

اِذَا دَعَا اَحَدُکُمْ فَلَایَقُلْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ، اِرْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ، اُرْزُقْنِیْ اِنْ شِئْتَ، وَلْیَعْزِمْ مَسْئَلَتَہٗ، اِنَّہٗ یَفْعَلُ مَایَشَاءُ وَلَا مُکْرِہَ لَہٗ۔ (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، ص ۱۹۴)

ترجمہ: جب کوئی شخص دعا کرے تو یہ نہ کہے کہ الٰہی تو چاہے تو مغفرت کردے، تو چاہے تو رحم فرما: تو چاہے تو رزق دے۔ دعا تو اس جزم و یقین کے ساتھ کرنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ ضرور مقصد کو پورا کرے گا۔ وہ جو چاہتا ہے اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ اس پر کوئی جبر کرنے والا نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ بندہ کو خدا کے فضل، اس کے جود و عطا، اس کی بے پناہ قدرت، اس کے بے شمار خزائن پر اعتماد کر کے جزم و یقین کے ساتھ سوال کرنا چاہیے۔ وجہ تردد کیا ہے۔ کیا وہ قادر نہیں؟ کیا اس کے خزانہ میں کمی ہے؟ کیا وہ جواد و فیاض نہیں؟ ہمارے جزم و یقین سے اس کے اختیارات ختم نہیں ہو جاتے۔ ہم کو اس تلقین کرنے کی حاجت نہیں کہ الٰہی تو چاہے تو کردے۔

(۴) دعا حضورِ قلب اور خشوع وخضوع سے کرنی چاہیے۔ اور دعا کے وقت اجابت و قبولیت کا یقین ہونا چاہیے۔ حدیث شریف میں وارد ہے:

اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَایَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ۔ (الترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات)

ترجمہ: خدا سے اس طرح دعا کرو کہ تم کو اجابت وقبولیت کا یقین ہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ ایسی دعا کو جو غافل اور بے پروا دل سے نکلی ہو قبول نہیں فرماتا۔

یہاں پر یہ خلجان ہوسکتا ہے کہ حضورِ قلب کا دعا کے لیے شرط ہونا تو ظاہر ہے۔ لیکن اجابت وقبولیت کے یقین کر لینے کو دعا کے شرائط میں کس وجہ سے داخل کیا گیا ہے۔ بندہ کا کام سوال کرنے کا ہے اگر دعا کے تمام شرائط و آداب کماحقہٗ بھی پائے جائیں تو کیا ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ دعا کو قبول ہی فرمالے۔ کیوں کہ وہ قادر ومختار ہے۔ کوئی چیز اور کوئی حالت اس کو کسی امر پر مجبور نہیں کرسکتی۔ مگر یہ خلجان غور نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بندہ کو جیسے اپنی تمام حاجات خداوند تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کا حکم ہے۔ ایسا ہی اس کو یہ بھی حکم ہے کہ جب اجابت دعا کے تمام سامان جمع ہیں اور جس کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہے وہاں کوئی امر مانع اجابت دعا نہیں ہے۔ نہ وہ کسی بڑے سے بڑے مطلوب کو پورا کرنے سے عاجز ہے، نہ اس کے خزانہ میں کسی چیز کی کمی ہے اور نہ بے خبر ہے کہ کسی دعا کرنے والے کی دعا کا اس کو علم نہ ہو۔ اور وہ کریم بھی ہے اور اس کا وعدہ بھی ہے کہ تم دعا کیا کرو ہم قبول کریں گے۔ پھر اگر تمام باتوں کے باوجود وہ اجابت میں تردد کرے تو گویا اس کو مذکورہ بالا باتوں میں کسی بات میں ترددو شک ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اجابت دعا کا یقین کر لینے سے خدا تعالیٰ کا اختیار ختم نہیں ہوتا۔ نہ وہ دعا کے قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ مگر بندہ کا کام یہی ہے کہ اپنی طرف سے یقین کامل کرے۔ ورنہ یا اس کی بندگی میں نقص ہے یا معاذ اللہ خداوند عالم کی صفات کمال میں سے کسی صفت کے اندر شک ہے۔

روایت ہے کہ ایک فقیہ جس کا نام حسن تھا، ابوعثمان کی بیمار پرسی کے لیے گئے اوران سے جا کر کہا کہ اے ابوعثمان آپ کوتو وہ روایات پہنچی ہوئی ہیں جو مریض کی دعا قبول ہونے کے بارے میں مروی ہیں۔ پھر آپ اپنے لیے کیوں نہیں دعا کرتے؟ یہ سن کرانھوں نے خدا تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور کتاب اللہ کی چند آیتیں تلاوت کر کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہم نے بھی ہاتھ اٹھائے۔ جب دعا سے فارغ ہو چکے تو انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ مبارک ہو تمھاری دعا قبول ہوگئی۔ میں نے کہا آپ خدا تعالیٰ پر قسم کھاتے ہیں؟ انھوں نے جواب میں کہا بیشک میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دعا قبول ہوگئی۔ بھلا تم کوئی خبر بیان کرو تو ہم اس کی تصدیق کر لیتے ہیں اور تم کو سچا جانتے ہیں۔ حق تعالیٰ ہم سے کچھ وعدہ کرے ہم اس کی تصدیق نہ کریں۔ حق تعالیٰ خود فرماتا ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ (غافر، پ۲۴، آیت ۶۰)

ترجمہ: تمھارا پروردگار فرماتا ہے مجھ سے دعا کیا کرو میں قبول کیا کروں گا۔

رہی یہ بات کہ دعا کے شرائط و آداب کے مہیّا ہونے کے باوجود اجابت و قبولیت کا یقین ہونے کے باوجود بسا اوقات آثار قبولیت ظاہر نہیں ہوتے۔ اس کا جواب ہم دوسرے موقع پر دیں گے۔ (ماخوذ از شرح شرعۃ الاسلام، ص ۱۶۴)

(۵) دعا کے وقت آواز بلند نہ کرے بلکہ اخفا کرے اور آواز کو حتیٰ الوسع پست رکھے اور سوائے ان مواقع کے جہاں جہر کا حکم یا اجازت ہے جہر نہ کرے۔ اور مواقع مخصوصہ کے جہر میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھے۔ کیوں کہ اوّل تو خشوعِ قلب کا تقاضا یہ ہے کہ زبان بھی پست ہو جائے اور بلند آوازی ظاہری طور پر عدمِ خشوع کی علامت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آواز بلند کرنے میں یہ بھی ایہام ہے کہ خدا تعالیٰ پست آواز کو نہیں سنتا۔ دیکھو حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا۔ (مریم، پ۱۶، آیت ۳)

جب کہ زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو خفی آواز سے پکارا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً۔ (الاعراف، پ۸، آیت ۵۵)

اپنے رب کو تضرع کے ساتھ مخفی طور پر پکارو۔

ایک حدیث میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَ قَدِمْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَلَمَّا دَنَوْنَا مِنَ الْمَدِيْنَةِ كَبَّرَ وَ كَبَّرَا النَّاسُ وَ رَفَعُوْا اَصْوَاتَهُمْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم يَااَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ الَّذِىْ تَدْعُوْنَ لَيْسَ بِاَصَّمَّ وَلَاغَائِبٍ اِنَّ الَّذِىْ تَدْعُوْنَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ اَعْنَاقِ رِقَابِكُمْ۔

(مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب استجاب خفض الصوت)

ترجمہ: آئے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔ اور جب مدینہ کے قریب پہنچے تو آپ نے تکبیر کہی۔ لوگوں نے بھی تکبیر کہی اور آواز کو بلند کیا آپ نے فرمایا کہ جس کو تم پکارتے ہو نہ وہ بہرا ہے اور نہ غائب ہے۔ وہ تو تمھارے اور تمھاری سواریوں کے گردنوں کے درمیان میں ہے۔

(۶) دعا کے وقت بہ تکلّف قافیہ بندی اور اظہار فصاحت سے پرہیز کرے۔ بلا تکلّف و تصنع و بلا ارادہ اگر کلام فصیح و بلیغ مقفّیٰ و مسجع زبان پر آجائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ اس لیے کلام کو بہ تکلف مقفّیٰ و مسجع کرنا اس کی دلیل ہے کہ دل طلب حاجت کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہے۔ اور نہ اس میں خشوع و خضوع موجود ہے۔ اسی طرح اظہارِ فصاحت بھی خشوع قلب کے منافی ہے دعا کے وقت اپنی ذلت عجز و مسکنت کا اظہار کرنا چاہیے۔ نہ کہ قادر الکلامی، فصاحت اور لسانی کا۔ بعض اکابر کا قول ہے:

اُدْعُ اللّٰهَ بِلِسَانِ الذِّلَّةِ وَالْاِفْتِقَارِ لَابِلِسَانِ اَلْفَصَاحَةِ وَالْاِنْطِلَاقِ۔

ترجمہ: خدا تعالیٰ کو ذلت اور احتیاج کی زبان سے پکارنا چاہیے نہ کہ فصاحت اور گویائی سے۔

(۷) دعا اصرار اور الحاح کے ساتھ ہونی چاہیے اور اس پر مواظبت و مداومت کرنی

چاہیے۔ حدیث شریف میں وارد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُلِحِّیْنَ فِی الدُّعَاءِ۔

(الجامع لشعب الایمان للبیہقی، ج ۳، ص ۱۶۷، حدیث ۱۱۲۰)

ترجمہ: خداوند تعالیٰ دعا میں الحاح کرنے والوں اور گڑگڑانے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(۸) نعمت وثروت، فراخی وخوش حالی، تنعم وترفہ، فقر وتنگدستی، شدائد ومصائب دونوں حالتوں میں دعا کرتا رہے۔ ایسا نہ ہو کہ اوّل حالات میں تو خدا تعالیٰ کو بھول جائے اور جب سختی ومصیبت کا وقت آئے تو اس کو خدا یاد آئے۔ یہ بات شان عبدیت کے بالکل خلاف اور حالات کفار ومشرکین کے مشابہ ہے۔ ان کا حال بھی یہی تھا کہ جب جہاز میں سوار ہوتے اور سمندر کی ہیبتناک موجوں کو دیکھ کر ہوش اُڑتے تو تمام خود بنائے ہوئے معبودوں کو بھلا کر اسی ذات پاک واحد کو پکارتے تھے۔ لیکن خشکی پر قدم رکھتے ہی پھر شرک شروع کر دیتے تھے۔ اکثر مالدار اور عیش پرست لوگ اسی بلا میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو جاتے اور اس درجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ سختی ومصیبت کے وقت بھی انابت ورجوع الی اللہ کی نوبت نہیں آتی۔ اور اگر مجبور ہو کر رجوع بھی کرتے ہیں تو اگرچہ رحمت خداوندی سب کے لیے عام وشامل ہے۔ اس میں صالح وطالح سب حصہ دار ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ نے رحمت عام کے باوجود دونوں کا استحقاق برابر نہیں رکھا۔ وہ اپنے فضل سے جو چاہے کرے۔ مگر وہ شخص اسی بات کے لائق ہے کہ سخت ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ اس کو آٰلْاٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ کُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنِ (کیا تو اب توبہ اور رجوع کرتا ہے۔ اور پہلے سے نافرمان تھا۔ اور مفسدین میں سے تھا) سے خطاب کیا جائے۔ حق تعالیٰ خود فرماتا ہے:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ۔ (القلم، پ ۲۹، آیت ۳۵)

ترجمہ: کیا ہم مسلمین کو مجرمین کی برابر کر دیں۔

مومن کی شان اور حالت کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کو نہ بھولے اور اپنے آپ کو بندہ، عاجز، مجبور اور محتاج کے سوا کچھ نہ سمجھے۔ اور مومن کو جو

اپنے آپ کو مخلوق و بندہ سمجھتا ہے، اس کے سوا سمجھنے کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔ وہ کسی وقت بھی دعا سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ راحت و عیش کی حالت زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ کم ظرف انسان ثروت و جاہ کی لذتوں سے آشنا ہوکر بہت جلد فرعون بن جاتا اور خدا تعالیٰ کو بھولنے لگ جاتا ہے۔ ایسے وقت اس کو ثبات علی الدین چاہیے اور کبر و نخوت بطر و ریا سے احتراز کرنا بہت ضروری ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ دنیا میں کوئی نعمت ایسی نہیں ہے، جس سے اوپر کوئی نعمت و دولت نہ ہو۔ پھر وہ نعمت کے کسی درجہ میں ہو اس کو اس سے اعلیٰ درجہ کے حصول کی دعا کرنی چاہیے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز فرماتے تھے کہ میرا نفس مزید نعمت کا مشتاق رہتا ہے۔ جب ایک تمنّا پوری ہوجاتی ہے تو اس سے اوپر کی آرزو کرتا ہے مجھے تمنّا تھی کہ چچا کی بیٹی یعنی فاطمہ بنت عبدالملک سے عقد ہوجائے۔ یہ ہوگیا۔ پھر تمنّا ہوئی کہ مدینہ منورہ کا والی ہوجاؤں۔ یہ بھی ہوگیا۔ تو اب تمنّا ہوئی کہ خلافت مل جائے۔ اب خلافت بھی مل گئی تو اب سب سے بڑی دولت و نعمت یعنی جنت و رضائے خداوند عالم کی آرزو ہے۔

تیسرے اس وجہ سے کہ دنیا میں ہر قسم کی نعمتوں کا جمع ہونا کسی ایک فرد میں بظاہر دشوار اور ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اگر کسی کو مال و دولت حاصل ہے تو صحت نہیں۔ صحت ہے تو فراغِ قلب نہیں۔ دشمنوں کے خوف سے مامون نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور خود اس نعمت کے زوال سے بھی مامون نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اس کو موجودہ نعمت کی بقا اور دوسری نعمتوں کے حصول کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ اس شخص سے زیادہ ناداں، جاہل و کودن اور قدرت خداوندی سے ناواقف کون ہوگا جو موجودہ حالت پر مغرور ہوکر منعم حقیقی اور قادر مطلق کو بھلا بیٹھے۔

اس کے علاوہ یہ ہے کہ جو شخص ایسی حالت میں جب کہ بظاہر اس کو ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہیں برابر خدا تعالیٰ کی درگاہ میں دست سوال دراز کرتا اور اپنی ذلت و افتقار کا اقرار کرتا رہتا ہے۔ وہ اللہ کے مقربین میں داخل اور خواص میں شمار ہوجاتا ہے۔ اور دربارِ خداوندی میں اس کی ایسی عزّت و وقعت قائم ہوجاتی ہے کہ اگر وہ کسی بات پر اڑ بیٹھے

اور حتمی طور پر اپنی دعا کی قبولیت کا دعویٰ کر بیٹھے تو خدا تعالیٰ کے یہاں بھی اس کی عزت قائم رکھی جاتی اور اس کی بات پوری کر دی جاتی ہے۔ دیکھو حدیث شریف میں وارد ہے:

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔

(مشکوٰۃ، باب فضل الفقراء وما کان من عیش النبی، ص۴۴۶)

ترجمہ: بہت سے پراگندہ بال غبار آلود شخص جس کو دروازوں پر دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہے، خدا کے یہاں ایسی وجاہت و مرتبہ والے ہیں کہ اگر خدا پر کسی بات کے کرنے کی قسم کھا بیٹھیں تو خدا تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرما دیتا ہے۔

یعنی ظاہر میں یہ لوگ کم حیثیت ہیں۔ کوئی ان کی قدر و منزلت نہیں جانتا۔ مگر خدا کے یہاں صاحب مرتبت ہیں یہ بزرگی ان کو کیسے حاصل ہوئی۔ محض عبادت، تضرع اور افتقار الی اللہ کی وجہ سے اور یہی وہ دعا ہے۔

پھر جب ایسا شخص مصیبتوں میں مبتلا ہو کر گڑگڑائے گا، اجابت و قبولیت ضرور اس کا استقبال کرے گی۔ عبد اللہ ابن عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

یَا غُلَامُ! اِحْفَظِ اللّٰهَ فِی الْخَلَوَاتِ یَحْفَظْكَ فِی الْفَلَوَاتِ۔

(تفسیر الرازی، سورہ فاتحہ، آیت۷، ج۱ اوّل)

ترجمہ: میاں صاحب زادے حقوق اور فرائض و آداب شریعت کی محافظت خلوت اور تنہائی میں کرتے رہو تو خدا تعالیٰ لق و دق بیابانوں میں تمھاری حفاظت کرے گا۔

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ جب امن و اطمینان کی حالت میں تم اطاعت و بندگی کرو گے، تمھارا تقرب درگاہ خداوندی میں بڑھے گا۔

حدیث شریف میں وارد ہے:

مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّسْتَجِیْبَ اللّٰهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْیُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِی الرَّخَاءِ۔ (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، ص۱۹۵)

ترجمہ: جس شخص کو یہ بات پسند ہے کہ خدا تعالیٰ شدت وسختی کے وقت اس کی دعا قبول فرمائے تو اس کو چاہیے کہ خوشحالی اور اطمینان کے وقت بکثرت دعا کرتا رہے۔

حجاج سفاک کے زمانہ میں ایک شخص گرفتار ہوکر آیا اور جیل میں ڈال دیا گیا۔ لیکن اس نے جیل میں پہنچ کر دو رکعتیں پڑھیں۔ اور کہا:

اَخْرِجْنِی السَّاعَةَ۔ (اے اللہ! مجھے ابھی جیل سے نکال دے۔)

(شرح شرعۃ الاسلام، ص۱۶۶)

جب ہی جیل کا دروازہ کھلا اور اس کو حجاج کے سامنے لے گئے۔ حجاج نے فوراً رِہائی کا حکم دے دیا۔ اس شخص نے حجاج سے اجازت لی کہ میں اہلِ جیل کو ایک کلمہ نصیحت کا کہہ دوں۔ کہا بہتر۔ اس نے جیل میں جا کر ان لوگوں سے کہا:

اُذْكُرُوا اللهَ فِي الرَّخَاءِ يَذْكُرْكُمْ فِي الضَّرَّاءِ۔ (شرع شرعۃ الاسلام، ص۱۶۶)

ترجمہ: خدا کو راحت اور کشایش کے وقت یاد کیا کرو وہ تم کو شدائد اور سختی کے وقت یاد رکھے گا۔

بعض فقرا سے روایت ہے کہ جنگل میں ایک بزرگ کانٹے دار درخت کے گرد پھرتے اور اس میں سے چھوارے چن چن کر کھا رہے تھے فقیر نے ان کو سلام کیا۔ انھوں نے جواب دے کر کہا لو تم بھی کھاؤ۔ یہ شخص جب کسی چھوارے کو ہاتھ میں لیتا تھا تو وہ کانٹا بن جاتا تھا۔ بزرگ نے تبسم کر کے فرمایا: بھائی یہ بات تم کو کیوں کر حاصل ہوتی۔ اگر تم خلوتوں میں خدا تعالیٰ کی اطاعت کیا کرے تو جنگل میں وہ تم کو تر چھوارے کھلاتے۔ (شرح شرعۃ الاسلام، ص۱۶۶)

ایک مرتبہ استاذ ابو اسحاق تشریف لے جا رہے تھے۔ سامنے سے چند آدمیوں نے حاضر ہو کر دعا کے لیے عرض کیا۔ فرمایا کیا بات پیش آئی کہا صوبہ کے گورنر کے یہاں دو عمدہ بچھڑے آئے تھے ایک مرتبہ تو وہ بھاگ کر جرجان پہنچے۔ وہاں سے پکڑ کر لائے تھے۔ اب دوبارہ بھاگ گئے۔ اگر وہ ہاتھ نہ آئے تو ہم مارے جائیں گے۔ استاذ سواری پر سے اُترے دو رکعتیں پڑھ کر دعا شروع کی۔ اتنے میں وہ لوگ آئے

اور کہا حضرت وہ مل گئے۔ شیخ کی خدمت میں ایک خادم تھا۔ اس نے عرض کیا: حضرت تیس برس سے خدمت میں حاضر ہوں آپ نے مجھ کو یہ دو رکعتیں اور یہ دعا نہ بتلائی، جن کے بعد فوراً دعا مقبول ہوگئی۔ فرمایا قبولیت دعا ان دو رکعتوں کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ تیس برس کی نماز اور لقمۂ حرام سے پرہیز کرنے کا نتیجہ ہے۔ (شرح شرعۃ الاسلام، ص ۱۶۶)

(۹) دعا کرنے سے قبل خدا تعالیٰ کا ذکر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا بھی آداب دعا میں سے ہے۔ ابوطالب مکّی نے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

اِذَا سَاَلْتُمُ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ حَاجَةً فَابْتَدُوْا بِالصَّلٰوةِ عَلَيَّ فَاِنَّ اللهَ تَعَالٰى اَكْرَمُ مِنْ اَنْ يَّسْاَلَ حَاجَتَيْنِ فَيَقْضِىْ اِحْدَاهُمَا وَيَرُدُّ الْاُخْرَ۔

ترجمہ: جب تم خدا تعالیٰ سے اپنی کوئی حاجت طلب کرو تو سوال سے پہلے مجھ پر درود بھیجو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے ایسا نہیں کرے گا کہ اس سے دو چیزیں طلب کی جائیں جن میں سے ایک کو پورا فرمائے اور دوسرے کو رد کردے۔

سلمہ ابن الاکوع صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا شروع کرتے نہیں دیکھا مگر یہ کہ ہمیشہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى الاعلى الوَهَّاب سے شروع فرماتے تھے۔ (شرح شرعۃ الاسلام، ص ۱۶۶)

فضالہ ابن عبید روایت کرتے ہیں: ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ ایک شخص آیا اس نے نماز پڑھی اور دعا کی۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ اِغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ آپ نے فرمایا تم نے جلدی کی۔ تم کو چاہیے تھا کہ نماز کے بعد اوّل خدا تعالیٰ کی ثنا کرتے اور مجھ پر درود بھیجتے پھر دعا کرتے۔ اسی درمیان میں ایک دوسرا شخص داخل ہوا اس نے نماز سے فارغ ہو کر اوّل خدا تعالیٰ کی ثنا کی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا۔ آپ نے سن کر فرمایا: اَيُّهَا الْمُصَلِّيْ اُدْعُ تَجِبْ۔ (اب دعا مانگو قبول ہوگی) (شرح شرعۃ الاسلام، ص ۱۶۶)

(۱۰) دعا میں عام مسلمانوں کو شریک کرنا آداب دعا میں سے ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے

کہ دعا یا تو ایسے اغراض ومقاصد کے لیے ہوتی ہے، جس میں سب شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً دعا مغفرت یا رفع درجات وغیرہ یا کسی اپنی خاص غرض ومقصد کے لیے ہوتی ہے اور دونوں صورتوں میں اس کو تمام مسلمانوں کے شریک کرنے سے خود اپنا نفع ہے۔ کیوں کہ اول صورت میں جب عام مسلمانوں کو شریک کرے گا تو اس عام مقصد کے حصول میں برابر اس کا فائدہ ہے۔ جماعت کے ذیل میں اس کا مطلوب بھی حاصل ہو جائے گا۔

اور درصورت ثانیہ اوّل تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرنا حصولِ مقصد کے لیے تمہید ہو جائے گا اور ان کے طفیل اس کا خاص مقصد بھی حاصل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جب دعا میں اپنے بھائیوں کو بھولے گا تو یہ اس کی طرف سے ایک قسم کا بخل ہوگا۔ جس کا اثر ممکن ہے کہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو۔ ایک حدیث میں وارد ہے:

مَنْ صَلّٰی صَلٰوۃً لَمْ یَدْعُ فِیْهَا لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ فَهِیَ خِدَاجٌ۔ (کنز العمال، الباب الثانی فی الدعاء، ص ٦٧)

ترجمہ: جس شخص نے نماز پڑھی اور اس میں مومنین اور مومنات کے لیے دعا نہ کی تو وہ نماز ناقص ہے۔

ایک روایت میں ہے:

اِنَّهٗ ضَرَبَ مَنْکَبَ مَنْ قَالَ اِغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ ثُمَّ قَالَ عَمِّمْ فِیْ دُعَائِكَ فَاِنَّ بَیْنَ الدُّعَاءِ الْعَامِّ وَالْخَاصِّ کَمَا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ۔

(کنز العمال، دوم، الباب الثانی فی الدعاء، ص ۵۳)

ترجمہ: آپ نے اس شخص کے مونڈھے پر جس نے اِغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ کہا تھا ہاتھ مار کر فرمایا کہ دعا کو مسلمانوں کے لیے عام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ عام اور خاص دعا میں اتنا فرق ہے جیسا آسمان وزمین کے درمیان فاصلہ ہے۔

ایک روایت میں ہے:

مَا مِنْ دُعَاءٍ اَحَبَّ اِلَی اللهِ مِنْ قَوْلِ الْعَبْدِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِاُمَّةِ مُحَمَّدٍ

مَغْفِرَۃً عَامَّۃً۔ (حاشیہ الجمل، باب صفۃ الصلاۃ، ج ۳، ص ۴۳۹)

ترجمہ: کوئی دعا خدا تعالیٰ کے نزدیک اس دعا سے زیادہ محبوب نہیں جس میں یہ کہا جائے کہ الٰہی امت محمدیہ کی مغفرت عام فرمادے۔

ایک روایت میں ہے:

اِنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلاً یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ فَقَالَ وَیْحَكَ لَوْعَمَّمْتَ لَاسْتُجِیْبَ۔ (ایضاً)

ترجمہ: آپ نے ایک شخص کو اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ کہتے ہوئے سنا تو فرمایا افسوس ہے اگر تم دعا کو عام رکھتے تو ضرور قبول ہوتی۔

لیکن جیسا کہ تمام مؤمنین و مؤمنات کو دعا میں شامل کرنا آداب دعا میں سے ہے ایسے ہی یہ بھی آداب میں سے ہے کہ دعا کو اپنے سے شروع کرے۔ اور اپنے بعد اپنے والدین کے لیے اور جمیع مؤمنین اور مؤمنات کے لیے۔

کتاب تعلیم المتعلم میں لکھا ہے کہ والدین کے لیے دعا کو ترک نہ کرے کیوں کہ ایسا کرنا فقر و تنگدستی کا سبب بن جاتا ہے۔

(۱۱) الفاظ دعا کا سمجھ کر زبان سے نکالنا بھی آداب دعا میں سے ہے رَٹے ہوئے اور ازبر الفاظ و کلمات کو بلا سمجھے بوجھے پڑھ لینا خلاف آداب دعا ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات آدمی کو الفاظ دعا اس طرح حفظ ہوتے ہیں کہ بلا اختیار زبان پر جاری ہوجاتے ہیں۔ اس کا دھیان ان کے مطلب و معانی کی طرف اور خاص اپنے مطلوب و مقصود کی طرف نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ مناسب وقت جو الفاظ اس کی زبان پر آئیں ان سے دعا کرے۔ اور منقول دعائیں اس کو یاد ہوں تو ان کے معانی و مفہوم کو سمجھ کر ادا کرے اور اگر بلا سمجھے بوجھے فقط پڑھتا چلا جائے گا۔ تو گو الفاظ کی برکت سے محروم نہ رہے گا مگر دعا کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔ اور نہ اس کے قلب میں رقت و خضوع پیدا ہوگا۔ جو دعا میں اصل اور اجابت دعا میں بہت ہی مؤثر ہے۔

(۱۲) دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا اور دعا سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھوں کو منہ پر پھیرنا

بھی سنّت اور آداب دعا میں سے ہے۔ دعا کے لیے کوئی وقت اور مقام متعین نہیں ہے۔ جس وقت جس مقام اور جس حالت میں چاہے خدا تعالیٰ سے دعا کر سکتا ہے۔ مگر بعض اوقات دعا کے لیے مخصوص بھی ہیں۔ اور ان میں ہاتھ اٹھانا احادیث سے ثابت ہے۔ مثلاً فراغت نماز کے بعد، سوا ایسے اوقات میں تو ہاتھ اٹھانا مسنون یا مستحب ہے۔ ان اوقات میں اگر ہاتھ نہ اٹھائے گا تارکِ سنت یا مستحب ہوگا۔ ان اوقات کے علاوہ بھی دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا آداب دعا میں سے ہے۔ اگر نہ اٹھائے تب بھی جائز ہے۔ کیوں کہ دعا کا تعلق قلب سے ہے اور حضور قلب سے خدا تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجات کو پیش کرنا بھی دعا میں داخل ہے۔ ایسی حالت میں زبان سے بھی الفاظ دعا ادا کرے اور ہاتھ نہ اٹھائے تو کافی ہوگا۔ لیکن بہر حال ہاتھ اٹھانا قبول دعا کے لیے مفید ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے:

اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحِيْ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اَنْ يَّرُدَّهُمَا صِفْرًا۔ (ابو داؤد، باب الدعاء/ص ۲۰۹)

ترجمہ: تمھارا رب نہایت حیا والا اور کریم ہے جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اس کو خالی ہاتھ لوٹا دینے سے حیا آتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ فِى الدُّعَاءِ لَمْ يَحُطَّهُمَا حَتّٰى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ۔ (ایضاً)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا میں ہاتھ اٹھاتے تھے تو بغیر منہ پر پھیرے نیچے نہ اُتارتے تھے۔

ہاتھوں کو اس طرح اٹھائے کہ مونڈھوں تک پہنچ جائیں اور ہتھیلیاں منہ کی جانب رہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

اِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْئَلُوْهُ بِبُطُوْنِ اَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْاَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا۔

(ابو داؤد، باب الدعاء/ص ۲۰۹)

ترجمہ: خدا تعالیٰ سے سوال کرو تو ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے ذریعہ سے سوال کرو ہاتھوں کی پشت کے ذریعہ سے نہ کرو۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

اَلْمَسْئَلَةُ اَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَ مَنْكِبَيْكَ۔

(ابو داؤد، باب الدعاء/ص ۲۰۹)

ترجمہ: دعا یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے برابر تک اٹھائے۔

لیکن مونڈھوں تک ہاتھ اٹھانا عام حالات میں ہے۔ اور وہ خاص حالات جن میں ابتہال وتضرع وزاری کا اظہار زیادہ مقصود ہوتا ہے، وہاں ہاتھوں کو بہت اونچا کرنا بھی آداب میں داخل ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قَالَ كَانَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِى الدُّعَاءِ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ اِبْطَيْهِ۔ (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، ص۱۹۶)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں ہاتھوں کو اتنا بلند اٹھاتے تھے کہ بغل مبارک کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔

استسقا کی نماز کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے۔ ابن عبّاس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِىْ فِى الْاِسْتِسْقَاءِ مَتَبَذِّلًا مُتَوَاضِعاً مُتَخَشِّعاً مُتَضَرِّعًا۔ (مشکوۃ باب الاستسقاء ص ۱۳۱)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز استسقا کے لیے تواضع، تضرع اور تخشع کے ساتھ معمولی لباس میں تشریف لے گئے۔

اور چوں کہ موقع نہایت تواضع کا ہوتا تھا، اس لیے دعائے استسقا میں اپنے معمول کے خلاف ہاتھ بھی بہت اونچا اٹھاتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ شَيْءٌ مِنْ دُعَائِهِ إِلَّا فِي الْإِسْتِسْقَاءِ فَإِنَّهُ يَرْفَعُ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ إِبْطَيْهِ۔ (ایضاً)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوائے نماز استسقا کسی دعا میں ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ استسقا میں اس قدر ہاتھ اٹھاتے تھے کہ بغل مبارک کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔

ظاہر ہے کہ حضرت انس کا یہ فرمانا کہ سوائے نماز استسقا کے دعا میں ہاتھ ہی نہ اٹھاتے تھے، علی العموم تو صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا غیر معمولی طریقے پر ہاتھوں کو بلند کرنا کہ ابطین مبارکین کی سفیدی نظر آنے لگے، سوائے دعا استسقا کے کسی اور دعا میں نہیں ہوتا تھا۔

اس ہمارے بیان سے جیسا کہ یہ معلوم ہو گیا کہ خشوع وخضوع کے وقت مخصوص مواقع میں عادت کے خلاف ہاتھ اٹھانا آداب دعا میں سے ہے۔ ایسے ہی وہ تعارض بھی رفع ہو گیا جو مذکورہ بالا احادیث اور حضرت عبداللہ ابن عمر کے ارشاد میں مفہوم ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں:

إِنَّ رَفْعَكُمْ أَيْدِيَكُمْ فِي الدُّعَاءِ بِدْعَةٌ مَازَادَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى هٰذَا يَعْنِيْ إِلَى الصَّدْرِ۔ (مشکوۃ، کتاب الدعوات، ص۱۹۶)

ترجمہ: دعا میں تمھارا ہاتھوں کو اٹھانا بدعت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینہ سے اوپر نہیں اٹھایا۔

کیوں کہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھوں کو عام عادت کے خلاف اٹھانا اور عادت بنالینا بدعت ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ استسقا وغیرہ میں بھی اس قدر اٹھانا بدعت ہے۔ یا علاوہ استسقا اور مواقع میں مطلقاً دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا بدعت ہے۔

(۱۳) دعا کے وقت وضو کرنا یا غسل کرنا اور دو رکعت نفل پڑھ کر دعا کرنا بھی آداب دعا میں سے ہے۔ یعنی اگرچہ دعا کے لیے کوئی ہیئت وحالت مخصوص نہیں ہے۔ ہر صورت سے جائز ہے مگر وضو یا غسل کر کے اور دو رکعت نفل ادا کر کے دعا کرنا زیادہ اہتمام پر

دلالت کرتا ہے اور یہ طریقہ اجابت دعا میں زیادہ مؤثر ہے۔

عبداللہ ابن ابی اوفی سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو خداوند عالم سے کوئی حاجت ہو، یا بنی آدم کے متعلق کوئی معاملہ ہو تو اس کو چاہیے کہ اوّل خوب اچھی طرح سنن و مستحبات کی رعایت کر کے وضو کرے۔ پھر دو رکعت پڑھے۔ اس کے بعد خداوند تعالیٰ کی ثنا کرے پھر مجھ (محمد) پر درود بھیجے اور کہے:

لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اَسْاَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَاتَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَاهَمًّا اِلَّافَرَّجْتَهٗ وَلَاحَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًى اِلَّا قَضَيْتَهَا يَااَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ۔ (مشکوٰۃ، باب التطوع، ص۱۱۷)

ترجمہ: نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے جو حلیم و کریم ہے۔ پاک ہے اللہ جو مالک ہے عرش عظیم کا۔ اور ہر قسم کی حمد اللہ کے لیے ہے جو رب ہے تمام عالم کا۔ طلب کرتا ہوں میں تجھ سے تیری رحمت کے اسباب کو اور تیری مغفرت کے قوی و موکد کرنے والے امور کو اور اس بات کو کہ ہر بھلائی سے مجھے حصہ ملے، ہر گناہ سے سالم رہوں۔ کوئی گناہ میرا ایسا باقی نہ رہے جس کو تو بخش نہ دے۔ اور کوئی غم و فکر ایسا نہ ہو جس کو تو زائل نہ کر دے۔ اور نہ کوئی مطلب جو تیری مرضی کے موافق ہو ایسا رہے جس کو تو پورا نہ فرما دے۔ اے ذات پاک خدا جو سب رحم والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

(۱۴) دعا کو مکرر تین بار کرنا بھی آداب دعا میں سے ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا دَعَا، دَعَا ثَلَاثًا وَاِذَا سَأَلَ سَأَلَ ثَلَاثًا۔ (مسلم، باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین کتاب الجہاد والسیر)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب دعا کرتے تھے تو تین دفعہ کرتے اور جب سوال کرتے تو تین مرتبہ کرتے تھے۔

(۱۵) دعا میں ایسی تمنّاؤں سے جو اس کے مناسب حال نہیں ہیں اور عجیب وغریب سوالات سے پرہیز کرنا چاہیے۔

تمنّا سے ہماری مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے بندہ کو اپنے تقرب حاصل کرنے کے لیے طاعات ومجاہدات کے طریقے اور ذریعے بتلا دیے ہیں۔ مگر وہ اس سے تو جان چراتا ہے کہ نفس پر تکلیف اٹھائے۔ عبادات واذکار میں مشغول ہو۔ ہاں خدا تعالیٰ سے سوال کرتا ہے کہ مجھ کو درجۂ ولایت تک پہنچا دے۔ یہ مانا کہ خداوند عالم اس پر قادر ہے کہ گنہگار ونافرمان بلکہ کافر کو آن کی آن میں معاصی وکفر کی ظلمت سے نکال کر درجۂ ولایت تک پہنچا دے۔ مگر سائل کو بھی اپنی حالت دیکھنی چاہیے۔ اس کو فی الحقیقت درجۂ ولایت تک پہنچنے کا شوق ہے تو کیوں نہیں اس ذریعہ کو اختیار کرتا، جس سے وہاں تک پہنچے، اور اگر نفس امارہ کی شرارت اس ذریعہ کے اختیار سے بھی مانع ہے تو خدا تعالیٰ سے طاعت وعبادات کی توفیق عطا فرمانے کی دعا کیوں نہیں کرتا اور جب یہ نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ دل میں اس بلند مرتبہ کی رغبت ومحبت جیسی چاہیے ایسی نہیں۔ بلکہ محض بیہودہ خیال اور تمنّا ہے۔

عجیب وغریب سوالات سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے دل میں سیکڑوں تمنّائیں گزرتی ہیں۔ اور یہ جانتا ہے کہ خداوند عالم ان اشیا کی عطا پر قادر ہے۔ مگر اس قسم کی تمنّاؤں کو ایسی تضرع وزاری کے وقت پیش کرنا ایک قسم کی بے ادبی میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی یہ کہے الٰہی مجھے جنت میں قصر ابیض عطا فرما دے۔ ہم کو یہ حکم ہے کہ ہم حق تعالیٰ سے جنت کو طلب کریں۔ اور جہنم سے پناہ مانگیں۔ اب اس قسم کی دعائیں کہ جنت میں سفید محل مل جائے۔ یا فلاں محل جو نہر کے دائیں جانب واقع ہے یا جس کے گرد اس قسم کے باغ ہیں یا اس کے اتنے درجات ہیں، حقیقت میں ہنسی مذاق میں داخل اور دُعا کرنے کی حالت سے کوسوں دُور ہیں۔ (شرعۃ الاسلام، ص ۱۶۷)

عبداللہ ابن المغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادہ کو دُعا مانگتے ہوئے سنا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ الْقَصْرَ الْاَبْيَضَ عَنْ يَمِيْنِ الْجَنَّةِ۔

ترجمہ: الٰہی میں تجھ سے وہ سفید قصر طلب کرتا ہوں جو جنت کے دائیں جانب ہے۔

تو فرمایا:

اَیْ بُنَیَّ! سَلِ اللّٰہَ الْجَنَّۃَ وَتَعَوَّذْ بِہٖ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہٗ سَیَکُوْنُ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ قَوْمٌ یَعْتَدُوْنَ فِی الطَّھُوْرِ وَالدُّعَاءِ۔ (ابو داؤد، باب الدعا، ص ۲۰۸)

ترجمہ: میرے بچے! خدا تعالیٰ سے جنت کا سوال کر۔ اور عذاب نار سے پناہ مانگ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میری امت میں ایک قوم ایسی ہوگی جو طہور یعنی وضو اور دعا میں حد سے تجاوز کر جائے گی۔

شرح مصابیح میں لکھا ہے کہ طہور میں حد سے تجاوز کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وضو شرعی اور سنت سے تجاوز کر جائے۔ (مثلاً اعضاء وضو کا تین بار دھونا مسنون ہے یہ شخص چار بار یا اس سے زیادہ دھوئے) اور دعا میں تجاوز سے یہ مراد ہے کہ ایسی چیز طلب کرے جس کی حاجت نہیں۔ یا ایسی بات کی خواہش کرے جہاں اس کا عمل وحال اس کو نہیں پہنچاتا۔ کیوں کہ یہ بے ادبی میں داخل ہے۔ (شرح شرعۃ الاسلام، ص ۱٦۷)

(١٦) قبلہ رو ہو کر بیٹھنا بھی آداب دعا میں سے ہے۔ کیوں کہ تضرع وافتقار و تأدب کی صورت جس قدر بنا سکے بنائے۔ کیوں کہ یہ موقع طلب وسوال کا ہے اور سائل کا ان چیزوں کو اختیار کرنا زیادہ مفید اور حاجت روا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آداب دعا میں یہ بھی لکھا ہے کہ دعا کے وقت ہاتھ پھیلائے تو اس طرح سینہ سے ملا کر پھیلائے جیسے مسکین کسی سے کھانا مانگتے کے وقت کرتا ہے۔

(١٧) دعا کے خاتمہ پر آمین کہنا بھی آداب دعا میں سے ہے۔

(١٨) جب دعا کی قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگیں۔ یعنی مریض نے صحت کے لیے دعا کی تھی اور آثار صحت ظاہر ہونے لگیں تو اس کو اس پر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ایک روایت میں آیا ہے:

مَایَمْنَعُ اَحَدُکُمْ اِذَا عَرِفَ الْاِجَابَۃَ مِنْ نَفْسِہٖ فَشَفٰی مِنْ مَرَضِہٖ

اَوْ قَدَمَ مِنْ سَفَرِہٖ اِنْ یَّقُوْلَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ۔

(کنز العمال، ج۶، ص۱۷۵۶)

ترجمہ: تم کو اس امر سے کون مانع ہے کہ جب اجابت کے آثار معلوم ہوں مرض سے شفا حاصل ہو جائے اور یا سفر سے واپس مکان پہنچ جائے تو کہے اس ذات پاک کا شکر ہے جس کی عزت اور جلال سے صالحات پوری ہوتی ہیں۔

(۱۹) اجابت دعا میں دیر ہوتی معلوم ہو جب بھی اس کو خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے۔ اور کہنا چاہیے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَعَالٰی عَلٰی کُلِّ حَالٍ۔

ایسا نہ کرے کہ اجابت میں دیر ہوتے دیکھ کر ناشکری پر آمادہ ہو جائے اور گھبرا کر کلماتِ ناشکری زبان سے نکالنے لگے۔

(۲۰) دعا کے لیے بہترین اوقات اور افضل حالات کا انتخاب کرنا بھی آداب دعا میں سے ہے۔ یہ وہ شرائط و آداب دعا ہیں جن کا دعا کے قبول ہونے میں بڑا دخل ہے۔ اور ان کے علاوہ بعض اور بھی بیان ہو سکتے ہیں۔ مگر اس قدر بیان ہونے کے بعد غالباً اب زیادہ کی ضرورت نہیں رہی۔ ان سب کو اگر غور سے دیکھا جائے تو کل دو قسموں پر منقسم معلوم ہوتی ہیں: ظاہری و باطنی۔ ظاہری سے ہماری مراد وہ ہیں جن کا تعلّق اعضا و جوارح اور عمل ظاہری سے ہے۔ مثلاً کھانا اور لباس کا طیب و طاہر ہونا۔ دعا میں اصرار و مداومت کا ہونا۔ مقفّٰی و مسجع عبارت سے پرہیز کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور باطنی سے وہ مراد ہیں جن کا تعلّق قلب سے ہے۔ مثلاً صغائر و کبائر گناہ سے توبہ کرنا، حضور قلب اور توجہ الی اللہ کا موجود ہونا، خشوع و خضوع کا پایا جانا وغیرہ۔

مگر اس کے باوجود یہ سب شرائط و آداب خواہ باطنی ہوں یا ظاہری اختیاری ہیں۔ یعنی بندہ کو دعا کے وقت اپنے ارادہ اور اختیار سے ان چیزوں کو اختیار کرنا چاہیے یا ان سے پرہیز کر لینا چاہیے۔

(۲۱) لیکن مذکورہ شرائط و آداب کے علاوہ ایک شرط ایسی بھی ہے جس کو اجابت دعا میں زیادہ دخل ہے اور اس میں بندہ کے عمل اور ارادہ کو دخل نہیں ہے اور اس کے پائے

جانے پر خدا تعالیٰ کی رحمت بندہ کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوتی ہے اور قبولیت دعا میں اس کو خاص دخل ہے۔

یہ بے اختیاری شرط ایسی ہے جس کو قبولیت دعا کے تمام شرائط و آداب کا اصل اصول کہا جائے تو بجا ہے، گویا اجابت دعا کا اصل ترتیب اس پر ہے۔

یہ شرط کیفیت اضطراری کی حالت ہے۔ یعنی بندہ کے اندر اضطرار کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کا دل تمام اسباب و ذرائع سے الگ ہو کر خالق کائنات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس کو اپنے کسی عمل و ارادہ پر اعتماد باقی نہ رہے۔ کسی شخص کی اعانت و امداد کا بھروسہ نہ رہے۔ بے اختیار اس کے تعلقات یک لخت ہر جانب سے الگ ہو کر صرف خالق و مالک کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ اور وہ اپنے دل و زبان، جوارح و اعضا سے سراپا حاجت و سوال بن کر خدائے بے نیاز کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ یہ وہ حالت ہے جو مسلسل اور لگاتار مصائب کے وقت عام افراد انسانی کو بھی گاہ بگاہ پیش آ جاتی ہے۔ اور اہلِ قلب و اہل حال کو اکثر و بیشتر حاصل رہتی ہے۔

اس کیفیت کو جس کا پیدا ہونا بندہ کے اختیار میں نہیں ہے۔ ایسی شرائط اجابت دعا میں نہیں بیان فرمائی گئی کہ یہ نہ ہو تو دعا مقبول نہ ہوگی۔ کیوں کہ کوئی بے اختیاری کیفیت، عمل اختیاری کے لیے شرط قرار دینے میں تکلیف مالا یطاق کا شبہ ہو سکتا ہے۔ دعا کی اجابت کے لیے وہی شرائط بیان کی گئی ہیں، جن میں بندہ کا ایک حد تک اختیار ہے۔ خشوع و خضوع بھی اگر چہ کیفیاتِ قلب میں سے ہے اور اس کا پیدا ہونا بھی بندہ کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن دعا کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ دل میں حضور نہ ہو تو بہ تکلّف خشوع و خضوع کی حالت بنائے۔

مگر خداوند جل مجدہ نے اس کے شرط و اصل اصول تمام شرائط ہونے کی طرف اس ارشاد میں اشارہ فرما دیا ہے:

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ۔ (سورۃ النمل: آیت ۲۶، پ ۲۰)

ترجمہ: کون ہے جو مضطر و بے قرار کی جب کہ وہ دعا کرے، دعا کو قبول کرتا ہے۔

ظاہر ہے اس ارشاد میں اجابت کو اضطرار پر مرتب فرمایا ہے۔ اور یہ ترتب جب ہی ہوسکتا ہے جب اضطرار کو اجابت میں دخل تام ہو۔

لیکن چوں کہ یہ حالت حدودِ اختیار سے خارج ہے اس لیے اجابت دعا کو اس پر موقوف و معین نہیں فرمایا۔

شرح حکم ابن عطاء اللہ میں ہے:

قَالَ بَعْضُ الْعَارِفِيْنَ اِذَا اَرَادَ اللهُ اَنْ يَّسْتَجِيْبَ دُعَاءَ عَبْدٍ رَزَقَهُ الْاِضْطِرَارَ وَالْاِضْطِرَارُ لَا يَتَحَقَّقُهُ الْعَبْدُ مِنْ نَفْسِهٖ فِيْ جَمِيْعِ حَالَاتِهٖ قَالَ بَعْضُهُمْ: اَلْمُضْطَرُّ الَّذِيْ اِذَا رَفَعَ اِلَى اللهِ يَدَهٗ لَمْ يَرَ لِنَفْسِهٖ عَمَلاً وَهٰذَا حَالٌ شَرِيْفٌ وَمَقَامٌ مُّنِيْفٌ يَعْسُرُ عَلٰى اَكْثَرِ النَّاسِ الْوُصُوْلُ اِلَيْهِ فَكَيْفَ يَتَحَقَّقُ مَا يَبْتَنِيْ عَلَيْهِ۔

ترجمہ: عارفین فرماتے ہیں کہ جب خداوند عالم کسی کی دعا قبول کرنا چاہتا ہے تو اس کے اندر کیفیت اضطرار پیدا فرمادیتا ہے۔ اور اضطرار ایسی چیز ہے جو بندہ کو تمام حالات میں حاصل نہیں ہوتی۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ مضطر وہ شخص ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی طرف ہاتھ اٹھائے تو اپنے نفس کے عمل وارادہ کی طرف مطلق اس کی توجہ نہ ہو۔ اور یہ ایک ایسا شریف حال اور عالی مقام ہے، جو کسی کو بمشکل حاصل ہوتا ہے۔ اور جب یہ حال و کیفیت حاصل نہیں تو اجابت دعا جو اس پر مبنی و مرتب ہے کیوں کر متحقق ہوگا۔

ان مقتدایان اسلام کے ارشاد کا حاصل وہ ہے جو بالکل توضیح و تشریح ہے ارشاد خداوند عالم جل مجدہ کی۔ اور مطابق ہے قواعد شرعیہ و عقلیہ کے کہ حالت اضطرار کو اجابت دعا میں پورا دخل ہے، خداوند عالم جب کسی پر رحمت فرماتے اور اس کی دعا کو درجۂ اجابت تک پہنچانا چاہتے ہیں تو اس کے دل میں اضطرار پیدا فرمادیتے ہیں۔ اور کیفیت اضطرار جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ اور بعض عارفین نے اس کی تشریح فرمادی ہے۔ یہی ہے کہ اس کی توجہ اپنے عمل وارادہ پر کسی کی امداد و اعانت سے الگ ہوکر صرف خداوند عالم کی طرف رہ جائے۔ اور ظاہر ہے کہ سائل کا حاجت مند مسئول

عنہ کا محتاج الیہ ہونا، پورا پورا اسی وقت محقق ہوتا ہے، جب کہ سائل تمام ذرائع کو الگ کر کے سوائے مسئول عنہ کے کسی کو حاجت روانہ سمجھے۔ پس گویا دعا کا وجود حقیقتاً اسی وقت ہوتا ہے جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ اور جب اس کیفیت کا حصول سہل نہیں بلکہ سخت دشوار ہے۔ اور اس کی دشواری اس وجہ سے بھی بڑھ گئی کہ بندہ کے اختیار میں اس کی تدبیر بھی نہیں ہے، اس لیے ثمرۂ دعا یعنی اجابت جس کا ترتب اس کیفیت پر کیا گیا ہے کیوں کر متحقق ہو سکتا ہے۔

اوقات دعا

دعا کرنے کے لیے نہ کسی مقام کی خصوصیت ہے اور نہ وقت کی۔ اس میں نہ حال کی پابندی ہے اور نہ حالت کی۔ اوّل تو آدمی کا قلب اپنے مال و خالق، رازق و منعم کی طرف ہر وقت متوجہ رہنا اور اپنی حاجات دینی و دنیوی کو زبان حال یا قال سے پیش کرتے رہنا چاہیے۔ بلکہ اگر کسی خاص مقصد و مطلب کے لیے دعا کرنا چاہے تب بھی کسی مقام و وقت کا پابند نہیں، مسجد میں اور اپنے مکان میں، نماز میں یا خارج از نماز، حالت قیام وقعود میں یا استراحت و مشغولی معاملات کے وقت دعا کر سکتا ہے۔ اس کے لیے طہارت جسمانی یا طہارت ثوب بھی شرط نہیں۔ بلکہ جس وقت اور جس حال میں چاہے دعا کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے یہاں سے قبولیت واستجابت کی توقع ہے۔

مگر پھر بھی بعض مقام و اوقات اور بعض احوال قبولیت میں زیادہ مؤثر اور حاجت کے پوری ہونے کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ ان اوقات اور ان مقامات اور ان احوال کا منتظر اور دعا کے لیے مستعد رہے۔

اوقات میں (۱) یوم جمعہ (۲) یومِ جمعہ کی آخری ساعت (۳) جمعہ کی اذان کے بعد (۴) عرفہ کا دن (۵) اذان کا وقت (۶) اذان و تکبیر کے درمیان (۷) تکبیر نماز کے وقت (۸) ظہر و عصر کے درمیان (۹) ہر روز زوال کا وقت (۱۰) رات کا آخری حصہ صبح صادق سے کچھ قبل (۱۱) رجب کی پہلی رات (۱۲) شعبان کی درمیانی

رات (۱۳) عیدین کی شب (۱۴) پانچوں نمازوں کے بعد (۱۵) رویت بیت اللہ کا وقت (۱۶) افطار صوم کا وقت (۱۷) لڑائی کی صف میں دشمنوں سے مقابلہ کے لیے کھڑے ہونے کا وقت، یہ سب اوقات قبولیت دعا کے خاص اوقات ہیں۔

دیکھو مذکورہ ذیل احادیث کو۔

(۱) خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ اٰدَمُ وَفِيْهِ أُخْرِجَ مِنْهَا وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ۔ (مشکوٰۃ، کتاب الجمعۃ، ص ۱۱۹)

ترجمہ: سب سے بہتر دن جس میں آفتاب طلوع کرتا ہے جمعہ کا دن ہے اسی دن آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اسی دن جنت کے اندر داخل کیے گئے۔ اور اسی دن جنت سے نکالے گئے۔ اور قیامت جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔

ایک روایت میں ہے:

وَفِيْهِ تِيْبَ عَلَيْهِ۔ (روضۃ المحدثین، حدیث نمبر ۵۴۰۸، ج ۱۱)

ترجمہ: اور اسی دن ان کی توبہ قبول کی گئی۔

(۲) اِنَّ مِنْ اَفْضَلِ اَيَّامِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ اٰدَمُ وَفِيْهِ قُبِضَ وَفِيْهِ النَّفْخَةُ وَفِيْهِ الصَّعْقَةُ فَاَكْثِرُوْا عَلَيَّ مِنَ الصَّلٰوةِ فِيْهِ۔

(مشکوٰۃ کتاب الجمعۃ، ص ۱۲۰)

ترجمہ: تمھارے بہترین ایام میں سے جمعہ کا دن ہے۔ اس دن آدم پیدا کیے گئے۔ اسی دن ان کا قبض روح ہوا۔ اسی دن صور پھونکا جائے گا۔ اور اسی دن صعقہ یعنی عام بیہوشی ہوگی تم کو چاہیے کہ اس روز مجھ پر خوب درود بھیجا کرو۔

(۳) مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اِلَّا وَقَاهُ اللهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ۔ (کنز العمال، جلد ۷، الباب الخامس فی صلوٰۃ الجمعۃ)

ترجمہ: جو کوئی مسلمان جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں وفات پاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبر کے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔

(۴) لَيْلَةُ الْجُمُعَةِ لَيْلَةٌ اَغَرُّ وَيَوْمُ الْجُمُعَةِ يَوْمٌ اَزْهَرُ۔ (مشکوٰۃ، باب الجمعۃ)

ترجمہ: جمعہ کی رات چمکتی ہوئی روشن رات ہے اور جمعہ کا دن چمکتا ہوا روشن دن ہے۔

(۵) اِنَّ فِی الْجُمُعَةِ لِسَاعَةٌ لَايُوَافِقُهَا مُسْلِمٌ يَسْاَلُ اللّٰهَ فِيْهَا خَيْراً اِلَّا اَعْطَاهُ اِيَّاهُ۔ (مشکوٰۃ، کتاب الجمعہ)

ترجمہ: جمعہ کے دن میں ایک ایسی ساعت ہے کہ کوئی مسلمان اس میں خدا تعالیٰ سے کسی قسم کی بھلائی مانگے وہ اس کو ضرور ملتی ہے۔

(٦) سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِیْ شَانِ الْجُمُعَةِ هِیَ مَابَيْنَ اَنْ يَّجْلِسَ الْاِمَامُ اِلٰى اَنْ تُقْضٰى الصَّلٰوةُ۔

(مشکوٰۃ، کتاب الجمعۃ، ص١١٩)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ساعت جمعہ وہ وقت ہے جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت سے نماز کے ختم تک ہوتا ہے۔

(۷) اِلْتَمِسُوا السَّاعَةَ الَّتِیْ تُرْجٰى فِیْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ اِلٰى غَيْبُوْبَةِ الشَّمْسِ۔ (مشکوٰۃ، کتاب الجمعۃ، ص١٢٠)

ترجمہ: جمعہ کے روز قبولیتِ دعا کی ساعت ہے اس کو بعد نماز عصر آفتاب کے غروب تک تلاش کرو۔

(۸) مَامِنْ يَوْمٍ اَكْثَرَ مِنْ اَنْ يَّعْتَقَ اللّٰهُ عَبْداً مِّنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَاِنَّهٗ لَيَدْنُوْ ثُمَّ يُبَاهِیْ الْمَلٰٓئِكَةَ فَيَقُوْلُ مَا اَرَادَ هٰٓؤُلَآءِ۔

(مشکوٰۃ، باب الوقوف بعرفۃ، ص٢٢٨)

ترجمہ: کسی روز خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم کے عذاب سے اس قدر کثرت کے ساتھ نجات نہیں دیتا جتنا کہ عرفہ کے دن دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قریب ہو کر ملائکہ سے بطور مسرت وفخر فرماتا ہے یہ لوگ کیوں جمع ہوئے اور کیا چاہتے ہیں۔

(۹) خَيْرُ الدُّعَاءِ دُعَاءُ يَوْمِ عَرَفَةَ۔ (مشکوٰۃ، باب الوقوف بعرفۃ، ص٢٢٩)

ترجمہ: بہترین دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے۔

(۱۰) مَا رُؤِیَ الشَّیْطَانُ یَوْماً هُوَ فِیْهِ اَصْغَرُ وَلَا اَدْحَرُ وَلَا اَحْقَرُ وَلَا اَغْیَظُ مِنْهُ یَوْمَ عَرَفَةَ وَمَا ذٰلِكَ اِلَّا لِمَا یَرٰی مِنْ تُنَزُّلِ الرَّحْمَةِ وَتَجَاوُزِ اللهِ عَنِ الذُّنُوْبِ الْعِظَامِ اِلَّا مَا رُؤِیَ یَوْمَ بَدْرٍ، فَقِیْلَ مَا رُؤِیَ یَوْمَ بَدْرٍ قَالَ اِنَّهٗ قَدْ رَاٰی جِبْرَئِیْلَ یَزَعَ الْمَلٰئِكَةَ۔ (مشکوۃ، باب الوقوف بعرفۃ، ص۲۲۹)

ترجمہ: کسی دن شیطان اس قدر چھوٹا، مردود ومطرود، حقیر اور غیظ وغضب میں بھرا ہوا نہیں دیکھا جاتا، جس قدر کہ عرفہ کے دن کیوں کہ وہ حجاج اور واقفین عرفات پر خداوند عالم کی رحمت کے نزول اور بڑے بڑے گناہوں سے عفوودرگزر کو دیکھتا ہے۔ البتہ بدر کے دن اس سے بھی زیادہ حقیر وذلیل وخوار ومغموم ومطرود دیکھا گیا۔ کسی نے عرض کیا کہ یومِ بدر میں کس حال میں دیکھا گیا فرمایا کہ اس نے جبرئیل کو ملائکہ کی صف بندی کرتے دیکھا۔

عرفہ کے روز اس حقیر وذلیل کا اپنے مساعی کی ناکامی پر اندوہ والم تو ظاہر ہے۔ اور یوم بدر میں چوں کہ شوکت اسلام کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور اس کی بدولت حجاج کا عرفہ میں جمع ہونا ظہور پذیر ہوا، اس لیے اس روز کی ذلّت وناکامی بیشک عرفہ کے دن سے بھی زیادہ ہونی چاہیے۔

(۱۱) لَا یُرَدُّ دُعَاءٌ بَیْنَ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَةِ۔ (مشکوۃ، باب فضل الاذان، ص۶۶)

ترجمہ: اذان اور تکبیر کے درمیان کی دعا رد نہیں کی جاتی۔

(۱۲) ثِنْتَانِ لَا تُرَدَّانِ اَوْ قَلَّمَا تُرَدَّانِ: الدُّعَاءُ عِنْدَ النِّدَاءِ وَعِنْدَ الْبَأْسِ حِیْنَ یُلْحِمُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً، وَفِیْ رِوَایَةٍ وَتَحْتَ الْمَطَرِ۔ (ایضاً)

ترجمہ: دو وقت ایسے ہیں کہ ان میں دعا رد نہیں ہوتی یا بہت کم رد ہوتی ہے: اذان کے وقت اور قتال کے وقت جب ایک دوسرے کو قتل کرتا ہو۔ ایک روایت میں ہے اور بارش کے نیچے۔

(۱۳) قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللهِ اِنَّ الْمُؤَذِّنِیْنَ یُفَضِّلُوْنَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْ كَمَا يَقُوْلُوْنَ فَاِذَا انْتَهَيْتَ فَسَلْ تُعْطَهٗ۔ (ایضاً)

ترجمہ: ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ مؤذن ہم پر فضیلت لے گئے۔ ارشاد ہوا کہ تم بھی وہی الفاظ ادا کرتے رہو جو مؤذن کہتے ہیں۔ اور جب اذان ختم ہو جائے تو خدا تعالیٰ سے جو مانگنا ہے، مانگو، ملے گا۔

(۱۴) كُنَّا نُؤْمَرُ بِالدُّعَاءِ عِنْدَ اَذَانِ الْمَغْرِبِ۔

(مشکوٰۃ، باب فضل الاذان واجابۃ المؤذن)

ترجمہ: صحابی فرماتے ہیں کہ ہم کو اذان مغرب کے وقت دعا کا امر کیا جاتا تھا۔

(۱۵) يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ اَلسَّمَاءَ الدُّنْيَا حِيْنَ يَبْقٰى ثُلُثَ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ يَقُوْلُ مَنْ يَّدْعُوْنِىْ فَاسْتَجِيْبُ لَهٗ مَنْ يَّسْأَلُنِىْ فَاُعْطِيْهِ مَنْ يَّسْتَغْفِرُنِىْ فَاَغْفِرَ لَهٗ وَفِىْ رِوَايَةٍ ثُمَّ يَبْسُطُ يَدَيْهِ وَيَقُوْلُ مَنْ يُّقْرِضُ غَيْرَ عَدُوْمٍ لَا ظُلُوْمٍ حَتّٰى يَنْفَجِرَ الْفَجْرُ۔

(مشکوٰۃ، باب التحریض علیٰ قیام اللیل، ص ۱۰۹)

ترجمہ: خداوند عالم تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اس وقت اترتا ہے جب کہ رات کا آخری تہائی حصّہ باقی رہ جاتا ہے اور فرماتا ہے کون ہے جو دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مانگے اور میں دوں؟ کون ہے جو استغفار کرے اور میں اس کے گناہ بخش دوں؟ ایک روایت میں ہے: پھر خداوند عالم اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتا ہے کون ہے جو ایسے کو قرض دے جو نہ مفلس ہے اور نہ ظالم۔ صبح کے طلوع ہونے تک یہی حالت رہتی ہے۔

(۱۶) اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِىْ جَوْفِ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَكُوْنَ مِمَّنْ يَّذْكُرُ اللّٰهَ فِىْ تِلْكَ السَّاعَةِ فَكُنْ۔

(مشکوٰۃ، باب التحریض علیٰ قیام اللیل، ص ۱۰۹)

ترجمہ: خداوند عالم رات کے آخری حصّہ کے درمیان جس قدر اپنے بندے کے

قریب ہوتا ہے اتنا کسی وقت نہیں۔ اگر تجھ سے ہوسکتا ہے کہ تو ان لوگوں میں داخل ہوجائے جواس وقت خدا تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو ضرور ہوجانا چاہیے۔

(۱۷) قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَيُّ الدُّعَاءِ اَسْمَعُ؟ قَالَ جَوْفُ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ وَ دُبُرُ الصَّلٰوتِ الْمَكْتُوْبَاتِ۔ (ایضاً)

ترجمہ: کسی نے عرض کیا: یا رسول اللہ کس وقت کی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ فرمایا آخری شب کے درمیان حصّہ میں اور فرائض خمسہ یعنی پنج گانہ نمازوں کے بعد۔

(۱۸) قَالَ اِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ نِصْفِ شَعْبَانَ فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا يَوْمَهَا فَاِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ اَلَا مَنْ مُسْتَغْفِرٌ فَاَغْفِرَ لَهٗ اَلَا مَنْ مُسْتَرْزِقٌ فَاَرْزُقَهٗ اَلَا مَنْ مُبْتَلٍ فَاُعَافِيْهِ اِلَّا كَذَا اِلَّا كَذَا۔

(سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی لیلۃ النصف من الشعبان، ص ۹۹

ترجمہ جب شعبان کی درمیانی رات ہو تو رات بھر نماز پڑھنی چاہیے۔ اور دن کو روزہ رکھنا چاہیے کیوں کہ حق تعالیٰ وتبارک اس رات غروب آفتاب کے وقت سے آسمان دنیا پر اُترتے ہیں اور فرماتے ہیں کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور میں اس کی مغفرت کروں؟ کون ہے جو مجھ سے رزق طلب کرے اور میں اس کو رزق دوں۔ کون بیمار یا مصیبت زدہ ایسا ہے جس کو میں عافیت دوں؟ کون ایسا ہے کون ایسا ہے؟

(۱۹) قَالَ يَطَّلِعُ اللهُ اِلٰى جَمِيْعِ خَلْقِهٖ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِجَمِيْعِ خَلْقِهٖ اِلَّا لِمُشْرِكٍ اَوْ مُشَاحِنٍ۔ (ایضاً)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ پندرھویں شعبان کی شب میں مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تمام مخلوق کی مغفرت فرما دیتا ہے مشرک اور کینہ پرور کے علاوہ۔

(۲۰) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ قَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلّٰى فَاَطَالَ السُّجُوْدَ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ قَدْ قُبِضَ فَلَمَّا

رَأَيْتُ ذٰلِكَ قُمْتُ حَتّٰى حَرَّكْتُ اِبْهَامَهٗ فَتَحَرَّكَ فَرَجَعْتُ فَلَمَّا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ وَفَرَغَ مِنْ صَلٰوتِهٖ قَالَ يَا عَائِشَةُ اَوْ يَا حُمَيْرَاءُ اَظَنَنْتِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ خَاسَ بِكِ قُلْتُ لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلٰكِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنَّكَ قُبِضْتَ لِطُوْلِ سُجُوْدِكَ فَقَالَ اَتَدْرِيْ اَيَّ لَيْلَةٍ هٰذِهٖ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ هٰذِهٖ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ وَيَرْحَمُ الْمُتَرَحِّمِيْنَ وَيُؤَخِّرُ اَهْلَ الْحِقْدِ كَمَاهُمْ۔

(ترغیب وترھیب، ص ۱۲۲۱)

ترجمہ: عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہا ایک رات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُٹھ کر نماز کی نیت باندھی اور سجدہ اس قدر لمبا کیا، جس سے مجھے گمان ہوگیا کہ آپ کی وفات ہوگئی۔ میں نے یہ دیکھا تو اُٹھی اور آپ کے انگوٹھے کو ہلایا۔ انگوٹھے نے حرکت کی تو میں واپس آ گئی۔ جب آپ سجدہ سے اٹھے اور نماز سے فارغ ہوگئے۔ تو فرمایا اے عائشہ یا فرمایا اے حمیرا (حضرت عائشہ کو بوجہ سرخ رنگ ہونے کے حمیرا بھی کہا جاتا تھا) کیا تم کو یہ گمان ہوا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے ساتھ نقصان پہنچانے کا معاملہ کیا؟ میں نے عرض کیا: قسم خدا کی ہرگز یہ بات نہ تھی، بلکہ مجھ کو آپ کے سجدہ میں پڑے رہنے سے آپ کی وفات ہونے کا خیال ہوگیا تھا۔ اور فرمایا تم جانتی بھی ہو یہ کونسی رات ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا یہ پندرھویں شعبان کی رات ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رات اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور استغفار کرنے والوں کی مغفرت فرماتا، رحمت کے طلب گاروں پر رحم فرماتا ہے۔ البتہ بغض رکھنے والوں اور کینہ وروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

(۲۱) عبداللہ ابن عمرو ابن العاص سے روایت ہے:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ لِلصَّائِمِ عِنْدَ

فِطْرِہٖ لَدَعْوَۃً مَّاتُرَدُّ۔ (عمل الیوم واللیلۃ لابن سنی، ص ۱۵۳)

ترجمہ: عبداللہ ابن عمرو ابن العاص فرماتے ہیں: میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ روزہ دار کے لیے افطار کے وقت ایک دعا ہے جو رد نہیں کی جاتی۔

(۲۲) عَنْ مَعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْیَی اللَّیَالِی الْخَمْسَ وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ لَیْلَۃَ التَّرْوِیَۃِ وَلَیْلَۃَ عَرَفَۃَ وَلَیْلَۃَ النَّحْرِ وَلَیْلَۃَ الْفِطْرِ وَلَیْلَۃَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ۔

(ترغیب و ترھیب، ص ۲۲۱)

ترجمہ: معاذ ابن جبل سے روایت ہے کہا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص نے پانچ راتوں کو زندہ رکھا (یعنی عبادت و دعا میں مشغول رہا) اس کے لیے جنّت واجب ہوگئی: ترویہ کی رات یعنی آٹھویں ذی الحجہ کی شب، عرفہ کی رات، یوم نحر کی رات یعنی دسویں تاریخ کی شب جو عید الاضحیٰ کی رات ہے، عید الفطر کی رات پندرھویں شعبان کی رات۔

(۲۳) عَنْ عُبَادَۃَ ابْنِ الصَّامَتِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَحْیٰی لَیْلَۃَ الْفِطْرِ وَلَیْلَۃَ الْاَضْحٰی لَمْ یَمُتْ قَلْبُہٗ یَوْمَ تَمُوْتُ الْقُلُوْبُ۔ (ابن ماجہ، باب فیمن قام لیلتی العیدین، ص ۱۳۷)

ترجمہ: عبادہ ابن الصامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص نے فطر اور اضحیٰ کی شب کو زندہ رکھا اس کا دل اس روز مردہ نہ ہوگا، جس دن قلوب مردہ نظر آئیں گے، یعنی قیامت اور حساب کے دن۔

(۲۴) مَنْ کَانَتْ لَہٗ اِلَی اللّٰہِ حَاجَۃٌ فَلْیَدْعُ بِھَا دُبُرَ صَلٰوۃٍ مَفْرُوْضَۃٍ۔

(کنز العمال، الباب الثامن فی الدعاء ج/دوم ص ۶۷)

ترجمہ: جس کو اللہ سے کوئی حاجت طلب کرنی ہو تو چاہیے کہ فرض نماز کے بعد دعا

کرے۔

(۲۵) **تُرْفَعُ الْاَیْدِیْ اِذَا رَأَیْتَ الْبَیْتَ عَلَی الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ وَبِعَرَفَۃَ وَ بِجَمِیْعٍ وَاِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ۔** (کنز العمال/الباب الثامن فی الدعاص ۶۸)

ترجمہ: تجھ کو ہاتھ اٹھانا چاہیے جب کہ تو بیت اللہ کو دیکھے۔ اور صفا مروہ کے اوپر اور عرفات میں اور مزدلفہ میں اور جب نماز کے لیے تکبیر کہی جائے۔

احادیث نمبر ایک سے نمبر سات تک اس پر شاہد ہیں کہ جمعہ کا دن، یومِ جمعہ کی آخری ساعات، جمعہ کی اذان ثانی کے بعد یہ اوقات قبولیت دعا کے لیے مخصوص ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یومِ جمعہ باوجودیکہ سارا مبارک اور باعظمت دن ہے مگر اس میں ایک ساعت ایسی بھی ہے جو یومِ جمعہ کی تمام گھڑیوں سے افضل اور مقبولیت دعا کے لیے مخصوص ہے۔

❑❑